DUE DATE

Cl. No. 810.5 Acc. No. 36900

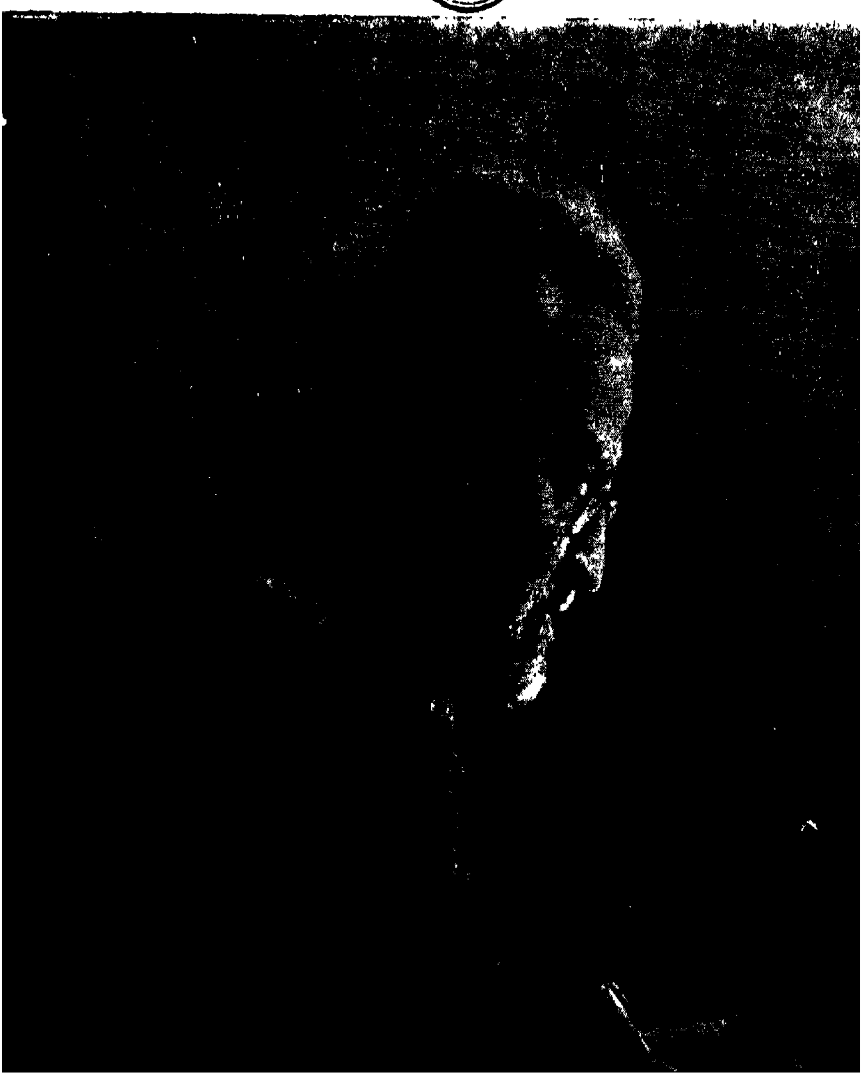
168K91,1

Late Fine Ordinary books **25p**. per day, Text Book Re 1 per day, Over night book Re 1 per day.

6	11		

اردو ادب

ذاکر نمبر



شمارہ ۳۱ ۱۹۶۹ء

انجمن ترقی اردو (ہند) کا سہ ماہی رسالہ

اردو ادب

(ذاکر نمبر)

ایڈیٹر

پروفیسر آل احمد سرور

انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ

قیمت سالانہ	بارہ روپیے
قیمت فی پرچہ	تین روپیے

کتابت ابو طاہر زیدی

مالک انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ، پرنٹر و پبلشر سید ضیاء علی نے لیتھو کلر پرنٹرس علی گڑھ میں چھپایا اور دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شائع کیا

اردو ادب

فہرست مضامین



ڈاکٹر ذاکر حسین مع اراکین خاندان
(داہیں سے بائیں) مسعود حسین ۔ یوسف حسین ۔ محمود حسین ۔ امتیاز حسین
(۱۹۳۲ء)

رشید احمد صدیقی

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

ذاکر صاحب کا انتقال ہو گیا۔ کتنی مختصر خبر لیکن کتنا بڑا حادثہ، اُن تمام لوگوں کے لیے جو اچھے شخص اور اچھی باتوں کا احترام کرنا جانتے ہیں۔ تین دن تک مسلسل دلی میں جو کچھ دیکھنے میں آیا اس سے اندازہ ہوا کہ آج بھی لاتعداد ایسے لوگ ہیں جو اچھے اشخاص اور اچھی باتوں کا احترام کرنا جانتے اور چاہتے ہیں۔ موت اور زیست ہر متنفس کے لیے لابدی ہے لیکن ان کا شرف کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔ ذاکر صاحب کی زندگی اور مرگ دونوں باشرف تھے اس لیے کہ ان کے دونوں ایک دوسرے سے مشرف تھے!

طبیعت کی افتاد کو کیا کہوں۔ کوئی اچھا شخص ہوتا ہے یا کوئی اچھا شغل تو معلوم نہیں کیوں اور کیسے دل میں یہ بات بیٹھ جاتی ہے کہ نہ یہ آدمی مرے گا نہ یہ شغل ختم ہوگا۔ پھر اسے کو کیا کہوں جو دونوں ایک ہی تھا۔ وفات کی خبر سُنی تو پہلا جھٹکا اسی کا لگا، اس لئے ذاکر صاحب اور یہ جہاں دونوں کا قران تھا۔ اقدار کو موت نہیں اس لیے کہ ان کا حامل خود واصل بحق ہو کر ان کو لازوال کر جاتا ہے۔ اعلیٰ اقدار کی حیثیت علوم متداول کے بندھے ٹکے اصول یا ظن و تخمین کی نہیں ہوتی۔ ان کو تابندگی و توانائی ملتی ہے افراد کے اعلیٰ عقیدے اور عمل سے۔

حادثے کی خبر سنتے ہی وہ ہوا جو بے اختیاری میں اکثر ہوا کرتا ہے جیسے اپنا وجود رہ گیا ہو نہ شعور۔ دہ درماندگی اور گذرے ہوئے دنوں کی یادوں کا ایک اجڑا ہوا قافلہ مرحوم کی تکریم و تعاقب میں رواں دواں ہو گیا۔ آواز سے بے اختیار رونے لگنا وہ بھی نوکروں بچوں اور عورتوں کے سامنے بڑھاپے میں زیب نہیں دیتا۔ لیکن کیا کروں حادثہ سخت ہو تو آداب محفل کو ملحوظ رکھنا میرے لیے بڑا مشکل ہوتا ہے۔ ایسا محسوس ہونے لگا اور کیا عجیب یہ احساس تھا کہ اس حادثے اور ایسے حادثے کے بعد اپنی تمام خوبیاں متاعِ کاسد اپنے تمام کارنامے بے نور، وہ تمام تعمیریں مسمار، وہ سبز و شاداب باغ جھلس گئے، نہریں خشک ہو گئی ہوں

اور امید و حوصلے کے وہ سفینے غرق ہونے لگے ہوں جن سے کبھی ذہن اور تخیل کی فضا معمور، منور اور معطر تھی۔ جیسے کسی جدید ترین ہولناک بم کے پھٹنے سے آدمی، جانور، ہوا، پانی، نباتات و جمادات اور ہر وہ چیز جو دیکھی یا محسوس کی جاسکتی تھی مسخ، معدوم اور پاش پاش ہونے لگی ہو۔ طبیعت کو جلد ہی قابو میں لانا پڑا تاکہ لوگ میری طرف متوجہ رہنے کے بجائے اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو جائیں اور میری وہ پشیمانی کم ہو جائے جو ان سب کے سامنے بلند آواز سے گریہ کرنے سے پیدا ہو گئی تھی۔

پھر ایسا معلوم ہوا جیسے ۱۹۱۵ء سے اب تک کا فصل زمانی و مکانی یک قلم مٹ گیا ہو اور ذاکر صاحب کے ساتھ اور ان سے دور اور نزدیک رہنے کے سارے واقعات، اور کیسے کیسے واقعات، جن سے محبت منزلت کی زندگی عبارت تھی اپنے تمام تنوع و تفصیل کے ساتھ دفعۃً حافظے میں جگمگا اٹھے ہوں۔ ماضی اور حال پر ایک ناچیز مخلوق کو یہ قدرت حاصل ہو تو اس علیم و قدیر کے اختیار و اقتدار کے بارے میں کون شک کر سکتا ہے جس کی ذات میں ماضی، حال اور مستقبل بیک وقت و ہمہ وقت پیوست و پایندہ ہوں۔ مستقبل کا علم مخلوق کے لیے چاہے جتنا ناممکن ہو خدا نے ہم کو یہ استعداد عطا بخشی ہے کہ ہم مستقبل پر حکم نہ چلا سکیں تو اس کے غلام بھی نہ بنیں۔ انسانی زندگی میں ماضی اور حال ہی کے خیابان اور خارزار سے مستقبل کا خیابان اور خارزار نمو اور نمود پاتا ہے! جو شخص ذاکر صاحب کے اس دنیا کے بے شمار حسنات سے واقف ہو وہ ان کی آخرت کے بیش از بیش اجر و انعام کا اندازہ آسانی کے ساتھ لگا سکتا ہے۔

جو پیدا ہوا ہے وہ مرے گا۔ اس سے زیادہ مہیب، ناقابل فہم اور ناقابل انکار حقیقت اب تک دریافت نہیں ہو سکی ہے۔ کتنی برحق اور کیسی کرب انگیز! یہ کرب کتنا بڑھ جاتا ہے جب رخصت ہونے والے میں وہ صفات یک جا ہو گئی ہوں جن کو اس نے نفس کے کیسے سرکش مطالبات سے منھ موڑ کر جن سے اس زندگی دو روزہ کی لذتیں وابستہ ہوں، جو زندگی کے دو روزہ ہونے کی وجہ سے اور زیادہ پر کشش اور ناقابل تسخیر ہوتی ہیں، اپنے اور اپنوں کے لیے نہیں بلکہ دوسروں کی اچھائی اور بھلائی کے لیے اکتساب کیے ہوں۔ موت پر اب تک صرف انسانیت فتح پا سکی ہے۔ اس سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ فہم و ادراک سے بیروں و برتر مشیت الٰہی میں انسان کا درجہ کتنا حسین و عظیم ہے۔ ذاکر صاحب اس حسین و عظیم کا نمونہ و نمائندہ تھے۔ کہتے ہیں ہر شخص کا مقدر پہلے سے متعین ہو چکا ہے جس سے وہ باہر نہیں جا سکتا۔ غالب نے اسی مایوس و منفی تصور کے پیش نظر اپنی بے دلی اور بے باکی کا اظہار کیا ہے، جب وہ کہتے ہیں۔ ع

نقل کرتا ہوں اسے نامۂ اعمال میں میں	کچھ نہ کچھ روز ازل تم نے لکھا ہے تو سہی!

لیکن اس جہان سے ایسے مردانِ حق بین وحق آگاہ گذرے ہیں اور گذرتے رہتے ہیں جن کو اپنی تقدیر اور اپنے ساتھ انسانیت کی تقدیر لکھنے کی تائید اس قدرت جلیل اور رحمتِ عظیم سے ملتی ہے جس کا انکشاف اور جس پر ایمان انسانی شعور وشرف کی معراج ہے۔ ذاکر صاحب کو میں ان ہی مردانِ حق بین و حق آگاہ میں سمجھتا ہوں۔ بڑے آدمیوں کی زندگی یہی بتاتی ہے کہ وہ جس درجے پر فائز ہوئے وہ ان کو کسی صبح وشام کو فانوتاً یا اتفاقاً نہیں مل گیا تھا بلکہ بہت دنوں میں بڑی سخت آزمائش سے گذرنے کے بعد میسر آیا تھا۔ مجبوری یا مختاری کا مسئلہ اتنا اعتراف وانقیاد کا نہیں ہے جتنا عزم واعتقاد کا۔ خدا اور انسان کا ایسا تصور بھی ہوسکتا ہے جہاں مروجہ نظریۂ جبر خدا اور انسان دونوں کے شایانِ شان نظر نہ آئے۔ خدا نے انسان کو جب اپنے پر بنایا ہے تو اس میں زیادہ صفات ایسی ہی رکھی ہوں گی جو دونوں کی منزلت پر گواہ ہوں۔ یہ صفات وہ ہوں گی جو صرف انسان کو ودیعت ہوسکتی ہیں فرشتوں کو نہیں۔ اس لیے کہ موخر الذکر کو جرأتِ اقدام INNITATIVE نہیں دی گئی ہے، ان کے لیے صرف ایک وظیفہ انقیاد وطاعت کا مقرر ہے جس سے وہ باہر نہیں ہوسکتے۔ دلیل نہیں اپنے احساس کی بنا پر کہوں گا کہ جب کبھی خیر کی طرف مائل ہوا تو بے اختیار محسوس کیا جیسے یہ خدا کی طرف سے مجھے دیا ہوا اختیار ہے جسے میں پوری مختاری سے کام میں لا رہا ہوں۔ لیکن جب کبھی برائی نے کھینچا اور اس کا ارتکاب کیا تو ہمیشہ اپنے اختیار کو اس کا باعث سمجھا۔ جبر واختیار کی میرے نزدیک ایک تعبیر یہ بھی ہے۔ یہ مثل صحیح ہے کہ کوئی شخص اپنے نج کے ملازم کی نظر میں دیر تک معصوم یا مقدس (سینٹ) نہیں رہ سکتا۔ نج کا سادہ لوح ملازم مالک یا مرشد کی کمزوریاں یا کمزوریوں کو بس کی کرامات پر بھی محمول کر سکتا ہے۔ ایسے ملازم سے کہیں زیادہ ساتھی طالب علموں کی نظر ہمہ گیر، ہمہ آشنا، سفاک اور بے باک ہوتی ہے۔ جیسے ایکسرے کی شعاعیں جو گوشت اور ہڈی میں نفوذ کر کے صورتِ حال کا انکشاف کر لیتی ہیں۔ بعض ساتھی طالب علموں کا وطیرہ یہ ہوتا ہے کہ اپنے سے بہتر و برتر رفیق یا حریف کی معمولی سے معمولی کمزوری کا پتہ لگا کر اپنی سنگین سے سنگین کمزوری یا لغزش کو وجہ جواز قرار دیتے ہیں۔ ادنیٰ درجے کے شخص کو سب سے زیادہ تسکین اسی طرح کی نالائقی میں ملتی ہے اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ اور ایم۔ اے۔ او کالج علی گڑھ کے ذاکر صاحب کے ساتھی ابھی کافی تعداد میں بقید حیات ہیں۔ ان میں ایسے بھی ہوں گے جو ذاکر صاحب کو عزیز ومحترم نہ رکھتے ہوں گے۔ ایسے بھی مل جائیں گے جو ان سے بغض وکینہ رکھتے ہوں گے۔ وہ بھی نہیں بتا سکتے کہ ذاکر صاحب سے کبھی کوئی لغزش ایسی ہوئی جو سن شعور سے فارغ التحصیل ہونے تک ان کے اچھے سے اچھے طالب علم، اچھے سے اچھے رفیق اور اچھے سے اچھے انسان ہونے کی حیثیت کو بے نور یا داغدار کرتی ہو۔

افترا پردازی، شرانگیزی اور آبرو ریزی کا سب سے بڑا موقع وہ ہوتا ہے جب کوئی شخص الکشن میں منتخب ہونے کے لیے کھڑا ہوتا ہے۔ کالج کے زمانے میں ذاکر صاحب کو اس آزمائش سے گذرنا پڑا تھا جب وہ یونین کے نائب صدر ہونے کے امیدوار تھے۔ اس زمانے میں یونین کے نائب صدر کی ہی حیثیت تھی جو آج صدر کی ہے۔ طالب علموں کا سب سے بڑا نمائندہ ہونے کے اعتبار سے اس کی منزلت قریب قریب اتنی ہی تھی جتنی اسٹانت کے کسی لکچرر کی۔ کتنا فصل اور فرق آگیا ہے اس عہد کے طالب علموں کے نمائندہ اور آج کے طالب علموں کے نمائندے کے درمیان۔ پہلے وہ اپنی تعلیم گاہ کا سفیر اور اس کی روایات کا امین ہوتا تھا، اب سیاسی اشخاص اور اداروں کا تابعدار و حکم بردار۔ کیسی خواری، کتنی عبرت! الکشن سے زیادہ معرکے اور دھوم کی کوئی اور تقریب کالج میں نہیں منائی جاتی تھی۔ بے ہودگی نام کو نہ ہوتی جو آج کل کے الکشنوں میں بالعموم دیکھی جاتی ہے۔ یہ الکشن سیاسی پرچھائیوں میں منعقد ہوتے ہیں اور جہاں سیاسی پرچھائیاں پڑ رہی ہوں وہاں کیا نہ ہوتا ہوگا! کالج کے ان انتخابات میں شریف گھرانوں کے نوجوان جن کی تربیت اچھی روایات اور صحت مند ماحول میں ہوئی ہوتی شوخی و شرارت کے ایسے شگوفے چھوڑتے کہ حریف بھی داد دیے بغیر نہیں رہتا تھا۔ الکشن کے زمانے کی ان گمنام تحریروں (نظم و نثر) کو دیکھ کر یہ بات ماننی پڑتی تھی کہ عریاں نگاری درا صل فن کار کی نارسائی ہے ورنہ لکھنے کا سلیقہ ہو اور ذہنیت مریضانہ نہ ہو تو عریانی، شوخ شگفتگی یا شگفتہ شوخی سے متجاوز نہیں ہوتی۔ کیسے کیسے گمنام فن کار اس زمانے میں کالج میں تھے یا ذاکر صاحب کا یہ تنہا امتیاز ہے کہ ان پر کسی قسم کے چھینٹے نہیں اڑائے گئے طنز اور ہجو کے تو کیا خوش طبعی اور شوخی کے بھی نہیں۔

وہ زمانہ کبھی نہ بھولے گا اور ذاکر صاحب کے اٹھ جانے کے بعد اس کو بھلا دینے یا اس کی شدت کے کم ہونے کا امکان اور بھی کم ہو گیا جب وہ صدر مملکت کے انتخاب کے لیے کھڑے ہوئے تھے اور پریس کا ایک سیکشن ان کے کردار کو مسخ اور مجروح کرنے کے لیے کیسی کیسی نجاست اچھال رہا تھا۔ فتنہ سازی، افترا پردازی اور آبرو ریزی کی کوئی حد نہیں چھوڑی تھی۔ اتنا تک لحاظ نہیں رکھا تھا کہ الکشن کسی تربیت نا یافتہ دور افتادہ گاؤں کی پنچایت کا نہیں ہندوستان کے صدر مملکت کا تھا۔ انتخابات کے زمانے میں فریقین کے ہفوات پڑھنے سے حتی الوسع بچتا ہوں لیکن ذاکر صاحب سے متعلق اس پریس کی ہرزہ سرائی پر سرسری طور پر کبھی کبھی ایک نظر ڈال لیتا تھا۔ اس خیال سے کہ شاید دو چار ہفتے کے اندر اس پریس کو ذاکر صاحب سے متعلق کچھ ایسی باتیں دریافت ہو گئی ہوں جو مجھ کو ان سے قریب رہتے ہوئے ۵۲ سال میں نہ معلوم ہو سکیں۔ آخر میں صرف یہ معلوم ہوا کہ ذاکر صاحب کے بارے میں جن باتوں کی تشہیر کی گئی تھی وہ ان کی

وقعت کو کم نہیں بلکہ بڑھاتی تھیں اور کوئی بھی ایسا نہ تھا جو ان باتوں سے پہلے واقف نہ تھا۔ ذاکر صاحب ان چند لوگوں میں تھے یا شاید تنہا ایسے شخص تھے جن کے خلاف کوئی سیاسی یا فرقہ وارانہ جماعت کوئی لغزش نہ دریافت کر سکی نہ ایجاد کر سکی۔

بایں ہمہ ذاکر صاحب شروع سے آخر تک کبھی بھی رہن سہن، شکل صورت، وضع قطع، میل جول، ہنسنے بولنے، رزم و بزم، تفریح و تفنن کے اعتبار سے دور دور تک عابد و زاہد یا سادھو سنت نہ تھے بلکہ ان میں تھے جن کے بغیر ہر محفل سونی ہوتی۔ جہاں ہوتے اس کی رونق و اہمیت کئی گونہ بڑھ جاتی۔ اجتماع کیسا ہی ہو، مہمان خصوصی کوئی ہو، سب کی نظر ذاکر صاحب ہی پر پڑتی۔ ان کی موجودگی سے مجلس کا ٹون صحت مند خوشگوار اور بلند ہو جاتا۔ ذہانت، شخصیت اور انسانیت میں سب ان کو اپنے سے بلند و بہتر سمجھتے تھے ان کے معاصرین خواہ شناسا ہوں یا اجنبی کسی جوابی نگاہ میں ذاکر صاحب کو رشک و رقابت کی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ وہ ہر ایک کے محبوب و محترم تھے۔ ہر شخص ان کی خوبیوں کا خوشی اور فخر سے اعتراف کرتا۔ اس عام محبت و عقیدت کو ان روایات سے بھی تائید ملی تھی جو ذاکر صاحب کے دو بڑے نیک نام اور نامور حقیقی بھائیوں نے کالج میں چھوڑی تھیں۔ کیا بتاؤں اس زمانے کے کالج کے شریف نوجوانوں میں علی روایات کی کیسی کارفرمائی تھی، اس کا کتنا احترام کیا جاتا تھا۔ روایات نہ ہونے پر یا اس بارگراں و گرامی کو اٹھانے کی توفیق نہ ہونے ہی سے تو وہ بُرے دن دیکھنے پڑ رہے ہیں جو بجائے خود بُرے نہیں ہوتے صرف مشکل تر عجیب تر تقاضے لاتے ہیں جن سے اپنی بعض کمزوریوں کے سبب سے نہ ہم آنکھ ملا سکتے ہیں نہ پنجہ۔ اس طرح ...ے مرد افگن عشق کوئی حریف نہیں ملتا۔ ذاکر صاحب کے بعد ان کی قد و قامت کی کوئی شخصیت علی گڑھ کے افق سے طلوع ہو سکے گی یا نہیں۔ اس کا جواب تلاش کرنا اتنا ضروری نہیں معلوم ہوتا جتنا اس کے لیے حوصلہ رکھنا اور دعا کرتے رہنا۔ یہ اس لیے کہتا ہوں کہ جیسا کہ ہوتا آیا ہے ... شخص علی گڑھ ہی کے ویران و درح خوار سے اُٹھے گا۔

ایم۔ اے۔ او کالج کی اس عہد کی فضا جو سر سید اور ان کے رفقائے کرام کی شخصیت اور خدمات سے زندہ و تابناک تھی اور ذاکر صاحب کی طویل رفاقت نے اچھا آدمی بننے اور رہنے کا شوق دیا۔ اس کا نہ دعویٰ ایسے دعوے کی کوئی اہمیت کہ اس شوق نے مجھے تمام کمزوریوں سے پاک کر دیا۔ ائمہ معصومین سے قطع نظر، کمزوریوں سے پاک ہونا انسان کی فضیلت نہیں اس لیے کہ یہ کمزوریاں بعض بڑی مصالح کی بنا پر اس میں رکھی گئی ہیں۔ البتہ علی گڑھ اور اس سے متعلق اچھی باتیں جسم و جان میں اس طرح پیوست ہو گئیں ... اور تیسرے درجے کی باتوں کی طرف دل مائل نہیں ہوا۔ جیسے امراض سے محفوظ رکھنے کے لیے

فطرت انسانی جسم میں دفاعی اور امتناعی قوت ودیعت کر دیتی ہے۔ ان عوامل نے ہر کرائسس (نازک مواقع) میں میری مدد کی۔ تقاضائے عمر سے جوں جوں قوے ضعیف اور معطل ہونے لگتے ہیں، امراض سے بچنے یا ان کا مقابلہ کرنے کی طاقت گھٹنے لگتی ہے۔ اور وہ وقت آجاتا ہے جو بالآخر آکر رہتا ہے۔ دوسری طرف اخلاقی توانائی جو صرف انسان کا کارنامہ ہے مرور ایام سے گھٹتی نہیں بلکہ بڑھتی رہتی ہے۔ اس سے فطرت اور انسان دونوں کے مرتبہ اور سطح کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ادارے اشخاص سے اہمیت حاصل کرتے ہیں اور اسی اعتبار سے یہ مردود یا معظم قرار پاتے ہیں۔ میرے عہد کا علی گڑھ اس کے بانی اعظم کے بعد جن شخصیتوں سے معظم ہوا ان میں ذاکر صاحب کا درجہ بہت نمایاں اور قابل فخر ہے۔

مسلمان ہوں، عبادت آبوں کی نہیں خدمت گذاروں کی نظر میں۔ اپنی اچھی صلاحیتوں یا کارگذاریوں کا سرچشمہ ان عقائد، اعمال، اقدار، احکام اور روایات کو جانتا ہوں جو اللہ نے اپنے اچھے اور اچھے سے اچھے بندوں کے ذریعہ مجھ تک پہنچائے اور پہنچاتا رہتا ہے۔ ان میں ان عزیزوں دوستوں اور بزرگوں کا بھی کچھ کم حصہ نہیں ہے جن کی اعلیٰ شخصیت اور کردار نے اللہ کے احکام اور اس کے بندوں کے حقوق کو پہچاننے اور ان کو بجالانے میں میری ہمت افزائی کی۔ علی گڑھ سے تقریباً مدت العمر سے وابستہ ہوں۔ یہاں ایسے اشخاص اور حالات سے بھی سابقہ ہوا جن کو اپنے زندگی کے اچھے دنوں میں شمار نہیں کرتا۔ ایسے اشخاص اور امور سے سابقہ ہونے پر اور زیادہ اس کا یقین ہوا کہ ہماری تاریخی عظمتوں اور خودداریوں کا جس کا ایک سمبل علی گڑھ بھی تھا کیسا عجیب وغریب فیضان تھا کہ اس نے کسی حال میں اپنے یا دوسرے سے کبھی مایوس یا بیزار ہونے نہیں دیا۔ بلکہ یہ عظیم حقیقت منکشف کر دی کہ نیکی اور سچائی جتنی اقلیت میں ہوگی اتنی ہی زیادہ بالآخر بدی اور باطل کی قوتوں پر غالب آئے گی۔ ذاکر صاحب جامع حیثیات اور جامع حسنات دونوں تھے۔ گذشتہ ۶۰-۷۰ سال میں ہندوستان کے مسلمانوں میں، جن میں دوسرے ممالک کے مسلمانوں کو شامل کر لیا جائے جب بھی کوئی فرق نہیں پڑتا مسلمانوں میں ذاکر صاحب جیسا جامع صفات شخص پیدا نہیں ہوا۔

مدت الایام طرح طرح کے عوارض کا شکار رہنے کے باعث ہمارا مزاج کچھ اس طرح کا بن گیا ہے کہ ہم اپنے اچھے افراد، اداروں اقدار، روایات اور اخلاق ومذہب میں کوئی نہ کوئی خامی فرض کر لینے اور اس کے اچھالنے میں غیر معمولی تسکین وفخر محسوس کرنے لگے ہیں۔ ایسوں کے نزدیک کوئی بڑائی بڑائی نہیں ہے، غلط اندیشی یا خوش فہمی ہے! البتہ اتنا سمجھنے سے معذور رہتے ہیں کہ بڑائی نالائقی

سے کبھی کبھی اس طرح بھی انتقام لیتی ہے۔ اگر خدا، قیامت، سزا جزا، رسول پاک (آیۂ رحمت) کی شفاعت اور تخلیق انسان کا مقصد و عظمت کا وہ تصور صحیح ہے جو مذہب نے بتایا ہے اور جس پر مجھ سے پہلے اور آج بھی بھی بے شمار و بدرجہا بہتر و برتر مسلمانوں کا ایمان رہا ہے، جن کے نقوش تاریخ کے صفحات اور دنیا کے چپے چپے پر پھیلے ہوئے ہیں تو اس پر یقین رکھتا ہوں کہ ذاکر صاحب آخرت کی ہر منزل میں اپنے پیدا کرنے والے کے حضور میں عقل و عشق کی اسی سپردگی و سرفرازی کے ساتھ حاضر ہوں گے اور واصل رہیں گے جن کی جھلک ان کی زندگی میں ہم دیکھتے تھے جب وہ خدا کے بندوں کے درمیان تھے، ہر چھوٹے بڑے کے رنج و راحت میں شریک ہوتے اس وقار، محبت اور فروتنی سے جو اچھے مسلمان اور اچھے انسان کا شیوہ رہا ہے۔

ذاکر صاحب ہر شخص کو عزت و محبت کا مستحق سمجھتے تھے۔ طالب علمی کی زندگی سے لے کر آخری جدائی تک انھوں نے بھولے سے بھی کسی موقع پر اپنی برتری نہیں جتائی۔ پردہ داری اور پردہ پوشی، عفو و درگذر ان کی سیرت کا ٹھیٹھ نمایاں اور قیمتی جوہر تھا۔ کسی موضوع پر بحث ہوتی اس میں تحمل، توازن اور خوش دلی ملتی۔ گفتگو سہل اور سادہ ہوتی ہوئی پُر معنیٰ، فکر انگیز، اور پُر معنیٰ اور فکر انگیز ہوتے ہوئے سہل اور سادہ ہوتی۔ یہ بات میں نے بڑے بڑے مشیخت مآب لوگوں میں نہیں پائی۔ علمی بحث میں قطعاً علمی انداز اور اعلیٰ سطح پیش نظر رکھتے۔ اشارۃً کنایۃً بھی اس کا اظہار نہ ہوتا کہ اپنی بات منوانا چاہتے ہیں۔ جب کہ آج کل کے کتنے لکھے پڑھے برخود غلط بوڑھے، اختلاف رائے پر، اگر مخاطب شریف ہو تو آبرو ریزی پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔

کوئی مناقشہ ہوتا تو صلح صفائی کرانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے تھے۔ فریقین کتنے ہی ضدی اور غیر ذمہ دار کیوں نہ ہوتے ذاکر صاحب کے حکم بنائے جانے پر بلا تامل راضی ہو جاتے۔ اس کی بڑی اچھی مثالیں ان کی صدارت میں راجیہ سبھا کے اجلاسوں میں ملتی تھیں۔ ان کی وفات پر سیاسی جماعت کے نمائندوں نے جو ہدیہ عقیدت پیش کیے ان میں ایک ممتاز کمیونسٹ ممبر کا یہ کہنا کہ ذاکر صاحب اپنی صدارت میں اپوزیشن کے تحفظ کو بھی ملحوظ رکھتے تھے بڑا تاریخی اور قابل فخر فقرہ ہے۔ شاید کسی اپوزیشن نے دنیا کے کسی سیاسی ادارے کے صدر کے اعزاز میں ایسا ہدیہ نہیں پیش کیا ہوگا۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ذاکر صاحب کے تصفیہ پر کسی نے بددلی یا اپنے غیر مطمئن ہونے کا اظہار کیا ہو۔ اس لیے کہ وہ دانشمندی اور قطعاً غیر جانبدار ہو کر تصفیہ کرانے کی کوشش کرتے تھے۔ علی گڑھ میں طلبا کی یونین کی نائب صدارت سے لے کر ہندوستان یونین کی صدارت تک ہر موقع اور معرکہ میں ذاکر صاحب کی شخصی دانش و دیانت ان کی منصبی حیثیت پر سایہ فگن اور اثر انداز رہی۔ بڑے آدمی کی یہ بڑی قابل لحاظ علامت ہے!

مایوس و ملول کو امید و اعتماد سے آشنا کرا دینا ذاکر صاحب کی شخصیت کا غیر معمولی امتیاز تھا۔ وہ

معمولی باتوں کی باتوں کی تلقین کرتے تھے لیکن بڑے نتائج کی بشارت دیتے جو بالعموم صحیح ثابت ہوتی ممکن ہے ایسے لوگ ہوں جو ذاکر صاحب کے مشورے پر عمل کرکے ثروت و اقتدار کے درجے پر پہنچ گئے ہوں لیکن میرے علم میں متوسط درجے کے بیشتر ایسے لوگ ہیں جو ذاکر صاحب کے مشورے پر کاربند ہوکر اور معمولی کامیابیوں سے دوچار ہوکر اپنے سے مسرور و مطمئن رہنے لگے۔ ان میں یہ تبدیلی کسی مجہول قناعت کے سبب سے نہ آتی جو افراد و اقوام کی حوصلہ مندی اور خطر پسندی کو مفلوج کردیتی ہے بلکہ یہ اس سادہ پسندی اور بلند خیالی کی بنا پر ہوتا جو ذاکر صاحب ان میں پیدا کردیتے۔ ذاکر صاحب جب تک جامعہ ملیہ کے براہ راست سردار و سالار رہے اراکین جامعہ میں قناعت کی تونگری بڑی واضح تھی۔ ذاکر صاحب آج سے نہیں ہمیشہ سے ینگ ٹرکس (YOUNG TURKS) اور اولڈ گارڈ (OLD GUARDS) دونوں کی نظر میں یکساں معتبر و محترم رہے، اس لیے نہیں کہ وہ کوئی بے ضرر سادھو یا پیر فقیر تھے بلکہ دونوں جانتے تھے کہ ذاکر صاحب ان کی خوبیوں اور خامیوں سے واقف تھے اور کسی طرح کی دھاندلی یا للّو پتو سے زیر نہیں کیے جاسکتے تھے اس حقیقت سے بھی بے خبر نہ تھے کہ ذاکر صاحب ہمیشہ سے ینگ ٹرکس سے زیادہ ینگ ٹرک اور اولڈ گارڈس سے زیادہ اولڈ گارڈ تھے۔ ایک چیز جو اب تک جامعہ کے چھوٹے بڑوں میں نمایاں ہے، جو کلیتہً ذاکر صاحب کی دین اور جامعہ کی روایت بن گئی ہے۔ وہ ارباب جامعہ کا سلیقہ، صفائی، میل و محبت سے رہنا، گردوپیش کو صحت افزا، خوبصورت اور دلکش رکھنا اور بالعموم سادہ، ستھرا اور سجل لباس پہننا ہے۔

جامعہ اب بہت پھیل گئی ہے۔ علی گڑھ کا بھی یہی حال ہے۔ علمی و تہذیبی اداروں کو جیسے کہ یہ ہیں اس طور سے پھیلانا یا پھیلنے دینا اچھا نہیں۔ ان کو علمی و تہذیبی ہی رکھنا بہتر ہے۔ دوسرے اور مختلف خطوط پر ان کی توسیع بے معنی بھی ہے اور مضر بھی۔ یونیورسٹیوں کو کثیر المقاصد، ہمہ جہت اور ہمہ گیر نہ ہونا چاہیے۔ ہر علم و فن کی یونیورسٹی کا علیحدہ ہونا ضروری ہے تاکہ تمام تر توجہ اور تگ و تاز اسی مقصد کے حصول پر مرکوز رہ سکے بصورت دیگر ادارے کے انتظامی و اخلاقی دروبست میں فرق آنے لگتا ہے گو مخصوص دشواریوں کی بنا پر ایسا کرنا ناگزیر ہوتا ہے۔ یہ باتیں خاص طور پر اس لیے کہنی پڑیں کہ کثیر المقاصد اور ہمہ جہت و ہمہ گیر یونیورسٹیوں کے لیے سالار اعظم بھی ذاکر صاحب ہی مانند ہمہ صفت موصوف ہونا چاہیے۔ وہ ہر طرح کے تعلیمی اداروں کے تقاضوں کو پہچانتے اور ان سے عہدہ برآ ہونے کی غیر معمولی صلاحیت رکھتے تھے۔ ان میں ایسی اخلاقی توانائی، ملنسری اور دیدہ و دانش تھی جن سے ادارے کی قدر و قیمت اور اس کے متعلقین و متوسلین اپنی بہترین صلاحیتوں کو برسرکار لانا اپنا فریضہ اور فخر جانتے تھے۔ یہی وہ باتیں ہیں جن کے نہ ہونے سے آج تعلیمی اداروں میں

وہ سب ہو رہا ہے جو نہ ہونا چاہیے لیکن ذاکر صاحب جیسی شخصیت اب پیدا کہاں ہو رہی ہے جن عقائد اقدام اور روایات سے وہ ساختہ پرداختہ تھے ان کی قدر و قیمت نہیں رہی لیکن ان کے فقدان کو ہم ہر لحظہ محسوس کرتے رہتے ہیں۔ اکثر یہاں تک خیال آیا ہے کہ استثنا رسے قطع نظر آج کل کی یونیورسٹیوں کے وائس چانسلر اس قد و قامت کے کیوں نہیں ہوتے جتنے پچاس ساٹھ سال پہلے بیشتر اسکولوں کے ہیڈ ماسٹر اور کالجوں کے پرنسپل ہوتے تھے۔

ذاکر صاحب کا ماضی ان کے حال سے اور ان کا حال ان کے ماضی سے کم شاندار نہیں رہا ہے۔ لیکن اس کا تذکرہ انھوں نے کبھی نہیں کیا۔ ہر بڑے آدمی کی طرح ان کو اس امر کا احساس تھا کہ حال کو ماضی پر فخر کرنے کے بجائے ماضی کو حال پر فخر کرنا چاہیے۔ کسی محفل میں ہوں۔ ناقابل برداشت بوڑھوں اور معصوم بچوں کی مانند نہ وہ اس کے خواہشمند ہوتے نہ اسے گوارا کر سکتے تھے کہ حاضرین کی تمام تر توجہ، تواضع اور تکریم ان ہی کے لیے وقف رہے۔ اس کے برخلاف خاص طور پر کوشاں رہتے تھے کہ وہ خود دوسروں کی طرف زیادہ سے زیادہ متوجہ رہیں۔ میں نے ان کو کسی سے کانا پھوسی کرتے آج تک نہیں دیکھا۔ ذاکر صاحب کا یہ امتیاز بذات خود مجھے نہایت درجہ پسند تھا اس لیے کہ میں نے بعض تعلیم یافتہ مہذب اور ماڈرن مردوں عورتوں کو اس بدتمیزی میں مبتلا پایا کہ دو سے زیادہ آدمی موجود ہوں اور دو شخص کانا پھوسی شروع کر دیں۔ اس سے بھی بڑی بدتمیزی یہ ہے کہ حاضرین میں سے کوئی شخص بالخصوص میزبان پوچھنے لگے کہ کیا کانا پھوسی ہو رہی تھی! بدنصیبی سے کسی شخص کو بدنامی یا رسوائی میں آ جائے تو اس کی تجسس یا ٹوہ لگانے سے جیسا کہ بعض نالائقوں کا شیوہ ہے۔ بہت دور رہ کر اس کی پردہ پوشی کرنا ذاکر صاحب اپنی ذاتی ذمہ داری سمجھتے تھے۔ بظاہر یہ بات معمولی معلوم ہوتی ہے لیکن آج کل سوسائٹی کا جو حال ہے اس میں جس بے رحمی اور بے حیائی سے ہم سب بالخصوص تعلیم یافتہ معمر اور مسلمان کسی بدنصیب کی رسوائی کی اشاعت میں حصہ لیتے اور لطف اٹھاتے ہیں وہ بھی کوئی راز نہیں ہے

ذاکر صاحب نے شاید ہی کسی کو تم کہا ہو۔ بڑوں کا کیا ذکر چھوٹے بچوں کو بھی وہ ہمیشہ آپ کہہ کر مخاطب کرتے اور پیار کرتے تھے۔ بچے بالعموم بوڑھوں کی طرف بہت کم ملتفت ہوتے ہیں لیکن ذاکر صاحب میں ان کے لیے کچھ ایسی کشش تھی کہ بے اختیار ان کی طرف مائل ہوتے۔ جامعہ کے ابتدائی دنوں میں جب وہ اوکھلے (جامعہ نگر) کو منتقل ہوئی تھی کبھی وہاں جانے کا اتفاق ہوتا تو ہمیشہ یہی محسوس کرتا کہ جیسے جامعہ کی فضا اور جامعہ کا سمبل (نشان امتیاز) معصوم بچے اور معظم ذاکر صاحب تھے۔ ذاکر صاحب کی شفقت اور بچوں کی شگفتگی کے ساتھ معلوم نہیں کیوں اس وقت شفیق الرحمٰن قدوائی مرحوم کی یاد آئی۔ کتنی حزیں اور دلنشیں! لیکن

جلد ہی ذاکر صاحب شفیق صاحب اور جامعہ کے اکٹھا تصور سے تسکین بھی ملی۔ اعلیٰ یادیں اور عظیم یادگاریں چھوڑ جانا بھی انسان کا کتنا بڑا امتیاز ہے جیسے خدا کی بخشی ہوئی نعمتوں میں یہ لوگ اضافہ کرتے جاتے ہوں۔ ذاکر صاحب بچوں کو کوئی قصہ کہانی نہ سناتے نہ ان کو نصیحت کرتے یا ڈراتے۔ ہمیشہ ان کی پسند یا ناپسند کھیل کود لباس اور کھانے پینے اور ان کے میل و محبت کے بارے میں اس لطف و محبت سے باتیں کرتے جس میں اب تک ان کا نظیر دیکھنے میں نہیں آیا۔ بچے نہ ان کو بوڑھا سمجھتے نہ جوان نہ ملا یا ماسٹر نہ اپنا کوئی رشتہ دار، بلکہ اپنا جیسا سمجھنے لگتے۔ بوڑھے پر کمسن معصوم بچوں کا یہ اعتبار کچھ کم قابل فخر و امتیاز نہیں ہے جس پر سب سے زیادہ ایک معلم ہی فخر کر سکتا ہے۔ انھی دنوں ایک شام کو حسب معمول ذاکر صاحب اس میدان کی طرف جا نکلے جہاں چھوٹے بچے کھیل میں ہمہ تن مصروف دھوم مچا رہے تھے۔ ایک بچے نے ذاکر صاحب کو آتے دیکھا تو کھیل چھوڑ کر دوڑتا ہوا آیا اور ان کی انگلی تھام کر کچھ دور چلا لیکن توجہ تمام تر ساتھی کھلاڑیوں کی طرف تھی۔ بالآخر نہ رہا گیا انگلی چھوڑ کر کچھ کہے سنے یا رسم بجا لائے بغیر دوڑ کر کھیل میں شامل ہو گیا۔ دو تین اور بچوں نے بالکل اسی طرح اس ڈرامے کو دہرایا۔ ذاکر صاحب مسکرائے، پھر بولے، یہ بچے بھی خوب ہوتے ہیں!

ذاکر صاحب نے اپنے آلام و آزار کا خواہ وہ جسمانی ہوں یا ذہنی برملا کبھی اظہار نہیں کیا کسی تکلیف میں مبتلا ہو جاتے تو دریافت حال کرنے پر یہی بتلاتے کہ تیزی سے زائل ہو رہی ہے۔ کبھی کبھی اس تیزی سے جیسے لاحق ہونے سے پہلے ہی زائل ہونے لگی ہو! ذاکر صاحب پر بیماری کے شدائد غالب آنے لگتے تو کراہنے اور بے اختیار ہونے کے بجائے کسی خوش الحان حافظ یا قاری سے کلام پاک سنتے۔ رفتہ رفتہ ان پر سکون طاری ہونے لگتا اور نیند آجاتی۔ اللہ اور اس کے کلام میں اس طرح تشفی و تقویت پانے والے وہی ذاکر صاحب تھے جنھوں نے دیار غیر میں غضب ناک خونیوں کے نرغے میں تنہا، بیماری سے نحیف و نزار، قاتلوں کے بھیانک اشاروں و ارادوں کے جواب میں ایک تبسم کے ساتھ کہا تھا "بحمداللہ مسلمان ہوں، جہاں چلنا ہو چلیے"! جاننے پہچاننے والے یا دوست اور عزیز آس پاس ہوں تو نہ معلوم کتنی باتوں کا لحاظ کرتے ہوئے آدمی اپنی ثابت قدمی اور دلیری کا اظہار کر سکتا ہے لیکن جہاں دور دور تک اپنا کوئی نہ ہو اور موت نزدیک سے نزدیک آ چکی ہو وہاں صرف اللہ کے دیے ہوئے ایمان و عقیدے پر بھروسہ کر کے قاتلوں کو ایسے الفاظ میں، اس اطمینان و انداز سے چیلنج دینا معمولی بات نہ تھی۔ ہر مذہب کے پیرووں میں ایسے لوگ ملتے ہیں جنھوں نے خدا کی راہ میں اپنی عزیز ترین متاع قربان کر دی۔ لیکن اپنی زندگی میں اپنوں میں ایسی مثال دیکھی نہ سنی۔ ان دنوں مسلمانوں کو جس قیامت کا سامنا ہے وہی کیا کم تھا کہ خود ان میں ایسے افراد کا ظہور ہونے لگا ہے جو اپنے اچھے سے اچھے لوگوں کو اس کی وفات کے بعد اپنی بُری سے بُری صلاحیتوں کا نشانہ بناتے رہتے ہیں۔ اخلاق

شرافت کے صحیفہ میں ایک آیت اس مضمون کی بھی ملتی ہے کہ جس کی وفات ہوگئی ہو اُس کے خلاف دشنام و بہتان سے پرہیز کرنا چاہیے اس لیے کہ وہ جواب دینے سے محروم ہو چکا ہے۔ کسی مرحوم کی مفروضہ کمزوریوں کو اللہ کے سپرد کرنا کہ وہ بخش دے اور خود اس کی سیرت و شخصیت کو مجروح و مسخ کرنے کے لیے مسلسل نیش زنی اور زہر چکانی کرتے رہنا اور اس سے حظ اٹھانا جس دماغی فتور اور نفسیاتی ناگفتنی کی علامت ہے اس کا اندازہ کرنا مشکل نہیں ہے۔ مفاسد و مکائد کا یہ طائفہ اس درجہ نامبارک نہ ہوتا تو اس سے دور رہنے کو غالب نے ایسے انسانی الہامی انداز میں نہ کہا ہوتا ع

زنہار ازاں قوم نباشی کہ فریبند حق را بسجودے و نبی را بدرودے!

علمائے سلف کے مقرر کیے ہوئے آئین و ضوابط کے خطوط پر ذاکر صاحب نے مذہب کو قرین علم و حکمت ثابت کرنے کی کبھی نہیں کوشش کی۔ وہ مذہب کے اوامر و نواہی کو زندگی میں برت کر مذہب کو قرین ثواب جاننے اور جتانے کے قائل تھے۔ حالت نزع میں مریض سے قریب اقربا و احباب کو کلام پاک اور کلمہ طیبہ پڑھنے کی جو ہدایت کی گئی ہے ذاکر صاحب نے اُسے اپنی زندگی میں سرمایہ تسکین و طمانیت بنا لیا تھا۔ وفات کے بعد جب تک میت سپرد خاک نہیں کر دی گئی اور اس کے دنوں بعد تک خدا کے لاتعداد بندے ایصال ثواب کے لیے کلام پاک کی تلاوت کرتے رہے، گذشتہ چند صدیوں میں یہ شرف دو ہی ایک مسلمانوں کو نصیب ہوا ہوگا۔ اس سے ذاکر صاحب کی روح کو جو جسم کی ارضی و عارضی ربط سے رہا ہو کر یوم الحساب تک آسودۂ رحمت رہے گی اس کو کتنی تسکین، تطہیر و ترفع حاصل ہوا ہوگا۔ ہر مسلمان اس کا اندازہ کر سکتا ہے۔

ذاکر صاحب ایک بار شدید انفلوئنزا میں مبتلا ہوئے۔ یہ دونوں پھیپھڑے ماؤف اور ٹمپریچر ۱۰۴۔ لیکن زبان سے بے اختیاری میں بھی کوئی کلمہ بیزاری، مایوسی یا تکلیف کا نہیں نکلتا تھا۔ چاہا کہ اس موقع پر وہ کلمات کہوں یا انداز اختیار کروں جو پہلے سے مقدر ہیں لیکن انھوں نے اپنی تکلیف کا نہیں میری بچیوں کی باتوں کا ایسے ہموار اور اپنے مخصوص دلکش انداز میں ذکر چھیڑ دیا جو ان ہی کا حصہ تھا۔ فرمایا آج رات دونوں[1] کھانے پر آ رہے ہیں نہ؟ میں نے کہا یہی کہنے آیا تھا کہ آپ کی طبیعت اتنی خراب ہے

---

[1] یہ واقعہ اس زمانے کا ہے جب ذاکر صاحب مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ میری سب سے چھوٹی لڑکی کی شادی ہوئی تھی۔ ذاکر صاحب نے لڑکی، اس کے شوہر اور بقیہ گھر والوں کو رات کے کھانے پر مدعو کیا تھا۔ کچھ دنوں بعد لڑکی کا انتقال ہو گیا اس حادثے کو گزر رہے دس بارہ سال ہو گئے لیکن اس نے مجھ سے وہ سب چھین لیا جن سے میں عبارت تھا اور جن کو حاصل

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

یہ تقریب کسی اور دن کے لیے کیوں نہ ملتوی کر دیجیے۔ بولے نہیں نہیں۔ میرے بیمار ہو جانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ان سبھوں کی موجودگی میں تکلیف کی طرف دھیان کم جائے گا۔ چنانچہ پروگرام کے مطابق ڈنر ہوا۔ کھانے کی میز پر سب بیٹھ گئے اور کھانا شروع ہوا تو ذاکر صاحب نے اپنے سونے کے کمرے اور ڈائننگ روم کے درمیان حائل پردے کو ہٹوا دیا اور اپنی چارپائی کھانے کے کمرے کے سامنے کرا لی۔ لیٹے لیٹے ہاتھوں کے اشارے اور متبسم چہرے سے اپنی خوشی اور شفقت کی چھینٹیں بکھیرتے رہے۔ کبھی کبھی دو ایک فقرے خوش طبعی کے اس لطف سے کہہ دیتے کہ فضا لہک جاتی اور مہمان نہال ہو جاتے۔ کھانا ختم ہو جانے کے بعد جب تک مہمان رخصت نہیں ہو گئے ان کے اس انداز دلنوازی سے سب سرفراز و شاد کام ہوتے رہے۔ جس تکلیف اور خطرے میں وہ مبتلا تھے، ڈاکٹروں کی جیسی ممانعت تھی اور رات جتنی گذر چکی تھی اس میں ذاکر صاحب کی یہ دوست داری اور نوازش اس وقت جس طرح یاد آ رہی ہے اور جن بدلے ہوئے اور پھر کبھی نہ بدلنے والے حالات میں آ رہی ہے کیا بتاؤں اس وقت اس نے دل کا کیا حال کر دیا ہے۔

وائس پریسیڈنٹ شپ کے زمانے میں ایک بار زیادہ بیمار ہو گئے تھے۔ دو ہی ایک دن بعد یوم جمہوریہ کی تقریب تھی۔ صدر جمہوریہ خود علیل ہونے کے سبب سے تقریب میں شریک نہیں ہو سکتے تھے۔ ایک سلسلے میں دہلی جانا ہوا۔ ذاکر صاحب کو غیر معمولی حد تک کمزور پایا لیکن مسکرا کر پذیرائی اس طور پر کی جیسے وہ نہیں میں بیمار اور تشفی و دل آسائی کا مستحق تھا۔ فرمایا ڈاکٹروں نے چند طبعی تقاضوں کو پورا کرنے کے علاوہ دوسرے تمام شریفانہ تقاضے ممنوع قرار دے دیے ہیں۔ عرض کیا اس حال میں یوم جمہوریہ کے طرح طرح کے آداب کے پورے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) حیات جانتا تھا۔ احباب اور اعزا جو میرے اس حال سے واقف ہیں وہ اس حادثے اور مرحومہ کا ذکر اشارۃً بھی میرے سامنے نہیں کرتے۔ اب جو کرتا رہتا ہوں وہ اس مجبوری اور ڈر کی بنا پر ہوتا ہے کہ اپنے اوپر اپنے لعنت نہ بھیجنے لگیں کہ نفس کے سارے مطالبات تو پورے کرتا ہے صرف کام نہیں کرتا۔ کیسی بے بسی اور اس سے بڑھی ہوئی بے اختیاری ہے کہ اس وقت اس سانحے کے ذکر سے نہ باز رہتے بن پڑتا ہے نہ بیان کرنے کی ہمت ہوتی ہے۔ فانی کا یہ شعر فانی ہی کی زبان سے سنا ہے لیکن اُس وقت وہ اثر نہیں ہوا تھا جو اب ہے ؎

جگ سونا تیرے بغیر آنکھوں کا کیا حال ہوا　　　دنیا جب بھی بستی تھی دنیا اب بھی بستی ہے!

خیال ہے کہ یہ شعر میری حالت کو پہنچ کر فانی نے نہ کہا ہو گا۔ اب دعا ہے کہ کوئی دوسرا وہیں پہنچ کر اسے پڑھنے پر مجبور نہ ہو!

کیے جاسکیں گے۔ جلوس کے مقررہ ضوابط کے ساتھ طے مسافت، فوجی طریقے پر دیر تک کھڑے رہ کر سلامی لیتے اور دیتے رہنا تندرست آدمی کے لیے بھی مشکل ہے چہ جائیکہ آپ جس کی ناتوانی کا یہ عالم ہو۔ بولے ٹھیک ہے لیکن حکومت نے اتنے دنوں تک اعلیٰ سے اعلیٰ معیار کے مطابق مجھ سے جو سلوک کیا ہے وہ اس مقصد کے پیش نظر کیا ہے کہ صدر جب کبھی علیل ہوں یا کوئی اور اتفاق آن پڑے تو نائب صدر کی حیثیت سے ان کی ذمہ داریوں کو پورا کرنا میرا اولین فرض ہوگا۔ موقع کی نزاکت دیکھتے ہوئے میں نے موضوع گفتگو بدلنے کی کوشش کی اور کہا آپ کا فرمانا درست لیکن جانا اتنا درست نہیں ہے۔ آپ جانتے ہیں واقعہ سخت ہو تو میں جان کو ہمیشہ عزیز رکھنے والوں میں رہا، اپنی ہی جان کو نہیں دوسروں کی بھی جان کو! ہنس پڑے پھر مدارات کا پروگرام شروع ہوگیا اور بات آئی گئی ہوگئی۔ تھوڑی دیر بعد رخصت ہو کر علی گڑھ واپس آگیا۔ لیکن پیش بیش برابر پیچھا کرتی رہی کہ موقع اتنا اہم، صحت کا یہ حال، پروگرام اتنا صبر آزما۔ خدا اپنا فضل رکھے تقریب کی روداد ریڈیو پہ سنی۔ اخبار میں تصویر دیکھی تو ذاکر صاحب کو حسب معمول ذاکر صاحب ہی پایا۔ جیسے نہ بیمار تھے نہ کمزور نہ کچھ اور نہایت اعتماد و وقار کے ساتھ تیر کی مانند سیدھے کھڑے ہوئے سلامی لے رہے تھے۔ میرے لیے یہ تعجب کی بات نہ تھی لیکن خوشی کی بہت زیادہ رہی ہے۔ اندیشہ یا آزمائش کا موقع آن پڑتا تو ذاکر صاحب کی کچھ باطنی طاقتیں بیدار ہو جاتیں۔ اس لیے کہ ایسے مواقع پر اور یوں بھی میں نے ان کو مطلق کسی تردد یا تذبذب میں مبتلا نہ پایا۔ ان کو کسی اعلیٰ قوت پر کامل یقین تھا جس سے وہ ہر حال میں خیر و فلاح کی امید رکھتے تھے اور میں نے تو کچھ ایسا ہی دیکھا کہ ایک اعلیٰ قوت نے ذاکر صاحب کی ہمیشہ مدد کی۔ کہ السس کتنا ہی سنگین ہوتا ذاکر صاحب اس کا سامنا کھلے میدان انتہائی امید و اعتماد کے ساتھ کرتے۔

مسلمان ہوں لیکن ایسا نہیں جس کی تقلید کی جائے۔ اسلام کے بنائے ہوئے راستے پر چلنے کی بہت کم توفیق ہوئی۔ اس کے باوجود مسلمان ہونے کو بڑا شرف اور ذمہ داری سمجھتا ہوں۔ خدا اور اس کے بندے دونوں کی طرف سے۔ اس سے اپنی ذہنی صلاحیتوں اور آرزو و عمل کو ہمہ وقت پرکھتے رہنے بڑی مدد ملی ہے۔ اس نے اعلیٰ اور عظیم کا احساس دیا۔ اعلیٰ اور عظیم تک رسائی نہیں ہوئی لیکن ان کو کبھی اپنی پہنچ سے باہر نہیں سمجھا۔ مجھے عبادت پیشہ مسلمان زیادہ ملے عبادت شناس اور عبادت گذار بہت کم۔

عبادت کا مفہوم یا مقصد یہ نہیں کہ خدا سے مزدوری، خیرات، انعام، تاوان وصول کرنے یا دوسروں پر فضیلت اور تفوق جتانے یا ان کو سنگسار کرنے کا حق اور اختیار حاصل ہو گیا ہو۔ ہر پندار بدمذاقی ہے لیکن عبادت کا پندار لعنت ہے۔ ایسی عبادت کی سزا مقرر ہے جو گناہ کی سزا سے زیادہ سخت اور عبرت انگیز ہو تو عجب نہیں۔ عبادت پیشہ عبادت کو ذہنی فریضہ سمجھتا ہے حالانکہ عبادت ہمہ وقتی وظیفہ ہے، زندگی کے ہر شعوری فعل میں جاری و ساری۔ اس عبادت سے عہدہ برآ ہونا آسان نہیں ہے۔ عبادت زندگی کو قبول کرنے کا اقرار و اقبال اور سعی عمل ہے۔ عبادت پیشہ اور عبادت گذار کا فرق یہ ہے کہ اول الذکر اپنی عبادت اور اپنے احسانات سے ہر وقت ہر کس و ناکس کو مطلع کرتا رہے گا جیسے ان کو چیلنج دے رہا ہو۔ عبادت گذار اپنی خدمات کو نہ کبھی ظاہر کرے گا نہ ظاہر ہونے دے گا بلکہ اس پر شرمسار رہے گا اور شکر گذار کہ خدا کی دی ہوئی زندگی جیسی نعمت اور سرفرازی کے مقابلے میں اس کی خدمات کتنی ناچیز ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ اور اس کے بندوں نے اسے قبول کر لیا تو اس کے لیے کتنا بڑا اشرف ہے۔ خدا کی صفات کو جانتے اور مانتے ہوئے اس کو دھوکا دینے کی کوشش ایسی حماقت ہے جس کے ارتکاب کی ایک عبادت پیشہ ہی جرأت کر سکتا ہے۔

یہ جو بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ انھی گناہوں کو معاف کرے گا جو حق اللہ کے ادا کرنے میں غفلت سے سرزد ہوئے ہوں گے، دوسری طرف حق العباد کو پورا کرنے میں جو تقصیر ہوئی ہو گی اس کو اپنی طرف سے معاف نہ کرے گا بلکہ معاف کرنے کا تمام تر حق یا اختیار اس کا ہو گا جس کی حق تلفی کی گئی ہو گی۔ مجھے نہیں معلوم اسلام کے خدا کے علاوہ دوسرے مذاہب کے خداؤں نے بھی یہ حق اپنے اپنے بندوں کو دیا ہے یا نہیں۔ اس سے ان لوگوں کو متنبہ ہونا اور رہنا چاہیے جو اللہ کی عبادت کی خانہ پری کر کے اس کے بندوں کو اپنی طاقت ہوس یا کینہ کا شکار بناتے ہیں۔ اللہ کی حکومت کو وہ ان زمینداروں کے تساہل کی مانند سمجھتے ہیں جو محصل یا اجارہ دار سے مقررہ رقم وصول کر کے اپنی رعایا کو ان کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتا ہے کہ جو سلوک چاہیں کریں۔ اس سلسلہ میں شفیع المذنبین کے درجہ کو بھی نظر میں رکھنا چاہیے۔ شفاعت کا نکتہ اس میں پوشیدہ ہے کہ خدا نے انسان کی شفاعت انسان ہی کے ہاتھ میں نہیں تو انسان کے بھی ہاتھ میں رکھی ہے اور انسان کا ارفع و اقدس نمونہ و نمائندہ حضور صلعم ہیں۔ یہ بات مشکل سے تصور میں آ سکتی ہے کہ حضور اکرم خدا سے اس شخص کی شفاعت فرمائیں گے جس نے ساتھی انسانوں کا حق چھینا اور ان پر ظلم کیا ہو گا۔ ظالم کو سزا خدا دے گا یا دنیا کا مقررہ قانون اور عدالت۔ ظالم کو معاف صرف مظلوم کر سکتا ہے۔ یہ بات اس لیے عرض کرنی پڑی کہ عبادت پیشہ حضرات عبادت پر زیادہ بھروسہ نہ فرمائیں۔ خلق کی خدمت اور خیر خواہی کی طرف مائل رہیں اس خدمت و خیر خواہی سے جو خلوص و خشیت سے آتی ہے خانہ پری سے نہیں۔ اگر ان کی

عبادت خلق کی خدمت و خیر خواہی سے خالی ہے تو ایسی عبادت وادیٔ غیر ذی زرع ہے جہاں نہ پانی ہے نہ پودا نہ پیڑول!

گفتگو طویل ہوگئی تھی اور بے محل بھی لیکن ذاکر صاحب کے کردار اور شخصیت کو اس بیان کی روشنی میں پرکھنے سے یہ معلوم کرنے میں مدد ملے گی کہ مذہب جو سرچشمہ ہوتا ہے ایمان، عقیدہ، عبادت اور خدمت کا اس کا ذاکر صاحب کا تصور کتنا بلند تھا اور کس طرح انھوں نے اپنی زندگی کے معمولات کو ان معتقدات سے مستحکم و مزین کیا تھا۔ ذاکر صاحب جہاں ہوتے صدر انجمن ہوتے تشکل و شمائل، ذہن و ذکاوت، شفقت و شائستگی، حفظ مراتب، تہذیب و اخلاق کی گراں مائگی اور نگار و فن میں بصیرت کے اعتبار سے اقدار عالیہ کی عظمت، اور فنون لطیفہ کی اہمیت کا براہِ راست تذکرہ ذاکر صاحب کی گفتگو میں معمولاً فلسفہ و حکمت کے دقائق، شعر و ادب کی عبارت و اشارت یا حکما اور ائمہ کے اقوال میں نہیں ہوتا تھا۔ وہ مجرد اقوال یا نظریات کا شاید ہی حوالہ دیتے۔ ایسے مواقع اور موضوع پر وہ بالعموم بڑے اور اچھے لوگوں کے اعمال صالح اور نفس انسانی کی سعادت و شرافت کو اس انداز و احترام سے پیش کرتے جیسے ان اچھے اور بڑے لوگوں کو ان کے حسنات کے ساتھ ہم ذاکر صاحب میں سُن، دیکھ یا چھو رہے ہوں۔ وہ ہر مذہب و مسلک کی اعلیٰ اور عظیم شخصیتوں کا حوالہ دیتے۔ انھوں نے خدمت کو عبادت اور عبادت کو خدمت کا درجہ دیدیا تھا اور دونوں کو حسن بینی اور حسن آفرینی کا وسیلہ بنادیا تھا۔

ذاکر صاحب کسی کے کام کی تعریف خواہ وہ عالم ہو یا عامی نہ بندھے ٹکے الفاظ میں کرتے تھے نہ دیر تک اور زیادہ سے زیادہ الفاظ میں کرتے لیکن دو ہی ایک فقرے میں ایسی دلنوازی اور بالغ نظری سے کر دیتے کہ مصنف کو اس کی ساری محن و محنت کا صلہ مل جاتا۔ اوروں کی مانند وہ کبھی ایسا انداز اختیار نہ کرتے جس سے اکثر اپنی بڑائی مقصود ہوتی ہے مصنف کی دلجوئی یا ہمت افزائی نہیں۔
ان کی وفات پر ایک برطانوی ہائی کمشنر اور دانشور نے کہا تھا کہ ذاکر صاحب کو دنیا کے کتنے زیادہ شعر و ادب سے واقفیت تھی کم کسی کو اندازہ ہو سکتا ہے۔ ایک انگریز (جو ہر کسی) کی تعریف کرنے میں تمام دوسری قوموں سے زیادہ محتاط اور کفایت شعار ہوتا ہے یہ رائے رکھنا معمولی بات نہیں ہے۔ اس لیے

ذاکر صاحب سے وقتاً فوقتاً علوم و فنون پر تبادلۂ خیالات کرنے کے بعد ہی یہ رائے قائم کی ہوگی۔ اور تو نہیں اردو مطبوعات کے بارے میں کہہ سکتا ہوں کہ شاید ہی کوئی ایسی کتاب شائع ہوتی جو ذاکر صاحب کے یہاں نہ پہنچ جاتی۔ یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے حیرت اس پر ہے کہ وہ سب ان کے مطالعہ سے گذرتیں اور ہر ایک کے بارے میں رائے قائم کر چکے ہوتے اور کیسی رائے جو صرف ذاکر صاحب ہی کا حصہ ہوتی شب خوابی کے کمرے سے ملحق کمرے میں ایک لمبی چوڑی میز پر ان مطبوعات کا انبار رہتا۔ ایک بار میں ساتھ تھا۔ میز کے قریب سے گذرے تو کچھ مطبوعات اٹھالیں۔ پوچھا ان کو پڑھا ہے میں نے کہا نہیں۔ وہیں ایک کتاب ایسی دکھائی دی جو میری نظر سے گذر چکی تھی۔ معلوم نہیں کیوں اور کیسے زبان سے نکل گیا، یہ کتاب بھی ملاحظہ سے گذری ہے۔ فرمایا۔ ہاں۔ پھر اس پر اپنے خیالات کا اظہار ایسے فی البدیہہ، ترشے اور تلے ہوئے فقرے میں کیا جو صرف ذاکر صاحب کا حصہ تھا! شاید بہت کم لوگوں کو یہ معلوم ہو کہ مصوری، شاعری اور تنقید کے جدید ترین معیار و موقف، ہیئت و مواد و اظہار و ابلاغ نیز ان کے معروف ترین دانشوروں کے افکار کا ذاکر صاحب کو کتنا واضح علم تھا! بات دراصل وہی تھی جس کا اظہار ان کی وفات پر ایک مقتدر کمیونسٹ ممبر پارلیمنٹ نے کیا تھا کہ ذاکر صاحب اپوزیشن کے تحفظ کو بھی پورے طور پر ملحوظ رکھتے تھے اور کیسے معتبر محافظ! ذاکر صاحب کے یہاں قدیم اور جدید جدا جدا خانوں میں نہیں بٹے ہوئے تھے بلکہ دونوں کے کسر و انکسار کا حاصل ملتا تھا جو ذاکر صاحب کے تصرف سے ایک نئے اور ترقی پذیر معیار کا پیام ہوتا اور نشاندہی کرتا۔ یہی وہ باتیں تھیں جن کے سبب سے ذاکر صاحب کبھی آوٹ آف ڈیٹ نہ ہو سکے اور آوٹ آف ڈیٹ نہ ہونے کا امتیاز و اختیار ہر شخص کے حصے میں نہیں آتا!

آئمہ کے ملفوظات کے مطالعہ کا موقع ملا ہے۔ وہ جن امور کی تلقین کرتے ہیں ان میں شک شبہ کی گنجائش نہیں لیکن زمانے کے بدل جانے اور جلد جلد بدلتے رہنے سے انسان کے فکر و عمل کو متاثر کرنے کے طریقے اور عوامل بھی وہ نہیں رہے جو پہلے کبھی موثر اور مقبول تھے۔ اب تشبیہ، استعارہ، تمثیل، اشارہ، کنایہ اور کشف و کرامات کے حوالے اور جنت دوزخ کا ذکر عام ذہنوں کو بھی اتنا متاثر نہیں کر پاتے جتنا پہلے کرتے تھے۔ اس لیے کہ ہر طرح کے علوم، معلومات مشاہدات و تجربات عام ہو گئے ہیں۔ ہر شخص، ہمہ وقت، ان کی قدر و قیمت جانتا رہتا ہے سائنس اور میکانیکی امور سے قطع نظر جہاں اعتقاد و اخلاق کو زیادہ دخل نہیں۔ مذہب اور اخلاق

اہمیت و افادیت کا تمام تر دارو مدار شخص کے صالح و صحت مند کردار پر ہے یعنی وہ خارج کے عناصر و عوامل پر نہیں بلکہ باطن کے ان شرارات اور حوالی پر کیسی نظر اور کتنی گرفت رکھتا ہے جو خارج پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ تسخیر فطرت انسان کا جتنا قابل فخر کارنامہ ہے۔ اتنا ہی اپنے پر تسخیر پانے میں ناکامی اس کا المیہ ہے۔ امریکہ نے چاند پر پاؤں رکھ دیا لیکن کالے پر اس کا پاؤں جہاں کا تہاں ہے! انسانیت فاتح عالم کی منتظر کبھی نہیں رہی، رحمت عالم کے لیے ہمیشہ چشم براہ رہے گی!

ذاکر صاحب میں وہ تمام صفات موجود تھیں جو کسی درماندہ، متشکک یا برہم و بیزار کو طمانیت خاطر سے بہرہ اندوز کر سکتی تھیں۔ وہ آرٹ اور علوم پر وسیع اور گہری نظر رکھتے تھے، سیرت کی بلندی، پختگی اور پاکیزگی کے لحاظ سے معتبر و محبوب تھے۔ ان میں مذہب کا جو خصوصی احترام ملتا تھا وہ کچھ تو خاندان سے ورثہ میں آیا تھا، کچھ بزرگوں کے فیض سے اور بہت کچھ انھوں نے اپنے کو تربیت دے کر حاصل کیا تھا۔ اس تربیت نفس کے لیے انھوں نے کتنا ریاض کیا ہوگا اس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو نہ صرف اس منزل سے گزرے ہیں بلکہ مسلسل گزرتے رہتے ہیں۔ وہ صوفی اور آرٹسٹ دونوں تھے، اسکالر بھی تھے عارف بھی۔ بقول پروفیسر ڈاکٹر سید عابد حسین ان میں اقبال کے مرد مومن اور گاندھی کے مرد حق کی شان ملتی تھی۔ یہ وہ صفات ہیں جو معلم کو پیغمبر کے قریب کرتی اور رکھتی ہیں۔ ہر مصلح یا مصلح اعظم بنیادی طور پر معلم اور ہر معلم امکانی اعتبار سے مصلح یا مصلح اعظم ہوتا ہے، اس ایک فرق کے ساتھ کہ رسول اور پیغمبر خدا کی طرف سے مامور ہوتا ہے اور معلم اس کے بندوں کا منتخب کردہ ہوتا ہے۔ ذاکر صاحب مزاج، فن اور فکر کے اعتبار سے معلم تھے۔ وہ ہر دیار و دربار کے لیے متفقہ طور پر اخلاق و انسانیت، صلح و سلامتی، آرٹ، ادب اور تہذیب کے سفیر اعظم منتخب کیے جا سکتے تھے۔ ان کے ہاتھ میں اقدار و اشخاص ہی نہیں ملکوں اور قوموں کے ناموس محفوظ تھے!

سیاست سے مجھے دلچسپی نہیں جس مشغلے میں فریقین ایک دوسرے کا اعتبار کرنے سے ڈرتے ہوں اس میں حصہ لینا میری جیسی واجبی عقل و ہمت والے کے لیے نہ ممکن تھا نہ مناسب۔ مذہب اور اعتقاد کے بارے میں بھی تجسس کی جرأت نہ ہوئی اس لیے کہ دل میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ مذہب کے دیے ہوئے اعتقاد و احکام میں تفتیش و تفحص کے معنی، استثنا کی اتنی گنجائش رکھتے ہوئے جتنی عموماً رکھی جاتی ہے، بدنیتی کے ہیں۔ یعنی مذہب و اعتقاد میں کرید بالعموم اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب دل اوامر سے گریز اور نواہی کا مرتکب ہونے کے لیے جواز و رعایات کی تلاش کرنے اور پالنے کی خواہش سر اٹھاتی ہے۔ اس قماش کے لوگ ہر جگہ نظر آئیں گے۔ ذاکر صاحب سے ان موضوعات پر گفتگو

کرنے کا کبھی موقع مل جاتا تو محسوس ہوتا کہ سیاست اور مذہب پر ایمانداری کے ساتھ یکجا سوچنے سے جو بصیرت حاصل ہوتی ہے وہ بڑا دل افروز ذہنی اور اخلاقی تجربہ ہوتا ہے۔ اکثر کہا کرتے تھے کہ ہر طرف سے منھ موڑ کر اور سیاق و سباق سے علاحدہ کرکے کسی مسئلہ بالخصوص سیاست اور مذہب پر سوچنے سے نتیجہ اکثر غلط اندیشی اور غلط روی ہوا ہے۔

ذاکر صاحب کو معلوم نہیں کب اور کیسے اتنا موقع مل جاتا کہ وہ ضروری اور مفید معلومات جلد سے جلد فراہم کر لیتے اور ان کو برمحل کام میں لاتے تھے جیسے یہ معلومات ان کے ذہن میں از خود جاگزیں ہوتی رہتی ہوں اور وہی اور اتنی جتنی کہ کارآمد ہوتیں۔ اتنا مرتب اور حشو و زوائد سے کلیتہً پاک ذہن کم دیکھنے میں آیا ہے۔ کیسی غمیں یاد طالب علمی کے دنوں کی اس وقت ذہن میں آ رہی ہے۔ تمام دن کبھی کبھی رات گئے تک یونین کلب۔ کالج کی لائبریری، احباب کے کمروں اور معلوم نہیں کہاں کہاں کا چکر لگاتے ہوئے کسی وقت نمودار ہو جاتے، گنگناتے، مسکراتے، شاداب و شادماں جیسے اپنے ہی سے نہیں ساری دنیا سے مطمئن و مسرور ہوں۔ سب یک زبان ہو کر پوچھتے ذاکر صاحب کہاں رہے۔ حسب معمول کیسے تفریحی اور گدگدانے والے انداز میں جس میں ذہانت و ذکاوت کی بڑی دلکش جھلک ملتی تھی کہتے "معلومات فراہم کرتا رہا"۔ اب کیا بتاؤں کہ اس زمانے میں "معلومات فراہم" کرنے کا فقرہ کیسے کیسے دلچسپ مفہوم میں استعمال ہوتا تھا۔ علوم و فنون سے قطع نظر، اشخاص و احوال سے بھی ان کی واقفیت کتنی حیرت انگیز تھی! کبھی کبھی ان پر گفتگو کرنے کا موقع آ جاتا۔ بعض نزاکتوں کا لحاظ کرتے ہوئے اس کی طرف "تامل و تذبذب" سے اشارہ کرتا تو مسکراتے اور کس مزے سے کہتے۔ نہیں نہیں کہہ ڈالیے، پھر طالب علمی کے زمانے کا فقرہ "معلومات میں اضافہ ہوگا" دہرا کر ہنس پڑتے۔ یک لخت ایسا محسوس ہونے لگتا جیسے ۵۰-۶۰ پہلے کے کالج کے شب و روز، بام و در، ہائے و ہو اور اخلاص و اعتبار کے دریچے کھل گئے ہوں۔ دلجوئی و ہمدمی کا اس طرح اظہار کرنے والا اب کہاں ملے گا۔ کہنا ختم کر لیتا تو اپنی رائے کا اظہار کرتے اس وقت معلوم ہوتا کہ صورت حال واقعتہً کیا تھی۔ کتنی ایسی باتیں ہوتیں جن کا مجھے یا تو علم نہ ہوتا یا غلط علم ہوتا۔ میرا تجربہ یہ ہے کہ ذاکر صاحب کی معلومات شاید ہی کبھی نامکمل یا غلط ہوتیں یا وہ کبھی کسی غلط فہمی میں مبتلا پائے گئے ہوں!

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ ذاکر صاحب سیاسی آدمی نہ تھے۔ اس اعتبار سے یقیناً نہ تھے کہ ان کی کوئی پارٹی ہوتی جس کا کوئی سیاسی مقصد یا موقف ہوتا اور اس پارٹی کے وہ باضابطہ لیڈر یا پیرو ہوتے۔ ذاکر صاحب عملی سیاست سے بلند و برکراں رہے لیکن انھوں نے سیاسی شخصیتوں اور سیاسی اسالیب فکر کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ وہ حکومت کے اعلیٰ مناصب پر رہے۔ اپنی دانشمندی، منصفی، ہمدردی اور وسیع النظری

سے سیاست کی ساحری اور شاطری کو حتی الوسع حدود سے آگے بڑھنے نہیں دیا منصب کی پابندی اور سیاست کی غیر ذمہ داری کو انھوں نے جام و سندان باختن کے معیار تک پہنچا دیا تھا۔ جن اعلیٰ عہدوں کی ذمہ داری انھوں نے سنبھالی اس کے غیر تحریر شدہ قانون اور روایت یہی تھی جس کو ذاکر صاحب نے قائم ہی نہیں کیا بلکہ اس کو مزید اہمیت و حرمت بخشی۔ جامعہ ملیہ کی پہلی جوبلی کے موقع پر ذاکر صاحب نے عملی سیاست کے مختلف نہیں بلکہ متضاد انداز فکر و عمل کے دو ممتاز ترین سربراہوں کو جیسے خونیں و آتشیں دور میں جامعہ کے پلیٹ فارم پر اکٹھا کر لیا تھا وہ اس زمانے میں کسی اور کے بس کی بات نہ تھی۔ یاد آتا ہے کرپس مشن کی گفتگو ایک موقع پر ناکام ہوتی نظر آنے لگی تھی۔ ہز ہائی نس نواب حمید اللہ خاں (بھوپال) بیچ میں پڑے تھے اور گفت و شنید کے آگے بڑھنے کا امکان پیدا ہو گیا۔ اس وقت یہ نواب صاحب کا کارنامہ سمجھا گیا تھا لیکن خود نواب صاحب کو اس مہم میں ذاکر صاحب سے کتنی قیمتی رہنمائی اور تائید حاصل ہوئی تھی اس کا علم بہت کم لوگوں کو ہے!

تقسیم ملک کے بعد سے تاریخ وفات تک انھوں نے وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی گورنر بہار، نائب صدر اور صدر جمہوریہ ہند کے فرائض ادا کیے۔ مسلم یونیورسٹی اس حالت کو پہنچ گئی تھی کہ خود یہاں کے سربرآوردہ حضرات میں سے ایک نے حیثیت منسٹر یو۔ پی کو آفر دیا تھا کہ وہ اس یونیورسٹی کو کلیتہً حکومت کے تصرف میں لے لیں۔ دہلی کے بعض نیم سرکاری اکابر کی طرف سے یہ پیش کش عام تھی کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، حکومت ہند کے حوالے کر دی جائے۔ اس کے بدلے پنجاب کی کوئی درسگاہ پاکستان کو الاٹ کر دی جائے۔ ان دنوں یونیورسٹی کے بہی خواہ کس درجہ مایوس و مضطرب تھے اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ باہر کا ہر ایرا غیرا، صبح و شام یہاں آکر جو کچھ جی میں آتا اور ظاہر ہے جی میں کیا کیا آتا ہوگا ہم کو سنا جاتا۔ جس کو کہیں پلیٹ فارم یا سامعین نہ ملتے وہ سیدھا علی گڑھ کا رُخ کرتا اس لیے کہ یہیں سے اس کی ناسزا گفتاری اس کے لیے موجب خیر و برکت ہوتی۔ تاریکی اور تہلکے کے اس عالم میں جب اپنے غیر اور غیر اپنے معلوم ہوتے لگے تھے، ذاکر صاحب تشریف لائے۔ اس کے بعد پھر کسی شخص کی مجال نہ تھی کہ علی گڑھ ہی نہیں کسی پلیٹ فارم سے ہمارے بارے میں کوئی ناسزا کلمہ کہنے کی جرأت کر سکتا۔ پھر جس دلسوزی، دانشمندی اور حوصلہ و ہمت سے انھوں نے اس ادارہ کو اس سیاسی جبر و قہر سے نجات دلائی جس سے وہ دوچار تھی اس کو کون نہیں جانتا۔ ذاکر صاحب نے رفتہ رفتہ یونیورسٹی میں اطمینان آسودگی، امن اور امید کی ایسی فضا پیدا کر دی جیسے اس سے پہلے یونیورسٹی ہی پر نہیں سارے ملک پر کوئی حادثہ نہیں گذرا تھا۔ ان کے چلے جانے کے بعد یونیورسٹی کیسے کیسے نرغے میں آئی کیا کیا

نہ ہوا، کہاں پہنچی اور ایک بار پھر اس کے بہی خواہ اس کے مستقبل کی طرف سے کتنے بد دل یا بے قرار رہنے لگے
ہیں وہ بھی کوئی راز نہیں ہے!

علی گڑھ سے رخصت ہو کر بہار کے گورنر ہوئے۔ اس زمانے میں بہار کے شرفا، اہل علم اور دوسرے دانشوروں
سے جو حالات سننے میں آئے ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ذاکر صاحب وہاں کتنے محبوب و مقبول تھے جس طرح کسی
جگہ کا پھل یا شیرینی مشہور ہو اور وہاں سے گزرنے والے ان کو خرید کر عزیزوں اور دوستوں کے لیے نہایت شوق
سے بطور تحفہ لے جاتے ہوں اسی طرح ان دنوں جو شخص بہار سے آتا وہ ہم سب کو ذاکر صاحب کی شرافت،
قابلیت اور منزلت کے قصے سناتا۔ ان دنوں فکر و فن کے اکابر کی سب سے زیادہ مان دان گورنر ہاؤس
میں تھی۔ طالب علموں کو ذاکر صاحب کے سایۂ شفقت میں اپنی سیرت و شخصیت کو سدھارنے سنوارنے
کا شوق پیدا ہوتا۔ ان کی دشواریوں کو دور کرنے کے لیے ممکن و مناسب تدبیریں عمل میں لائی جاتیں۔ بہار کی
اچھی، قیمتی اور تاریخی یادگاروں کو محفوظ کرنے کے انتظامات کیے گئے۔ بہار کے احباب بتاتے تھے کہ جہاں تک
علم و فن کی سرپرستی اور عالموں کی قدر افزائی کا تعلق تھا۔ بہار میں ذاکر صاحب کی گورنری امرائے پیشیں کے
عہد کی یاد تازہ کرتی تھی۔

سیاست کے بیوپار اور بازار میں، جنس اور نرخ کو بیوپاری جس جس طرح پلٹے دیتے اور خود پلٹے کھاتے
رہتے ہیں۔ ان سے واقف بھی ہوں نفور بھی۔ ان بیوپاریوں کے ہاتھ اور دیدے کی صفائی کس نے نہ دیکھی ہوگی
ذاکر صاحب جب تک بہار کے گورنر رہے وہاں کی سیاسی پارٹیوں کی ہر سطح پر ہر طرح کے جوڑ توڑ اور اتار چڑھاؤ
دیکھتے رہے اور ان کو اس طرح نظر میں رکھا کہ کسی فرد یا جماعت کو کھل کھیلنے کی جرأت نہیں ہوئی۔ ذاکر صاحب
کا یہ اثر منصبی ہرگز نہ تھا اور نہ ہو سکتا تھا۔ یہ صرف ان کی ہر داغ سے پاک اور ہر برتری سے آراستہ و محکم شخصیت
تھی جس کے سامنے کسی نااتفاقی کو سر اٹھانے کی ہمت نہ ہوتی تھی اور بہار کی سیاسی ہوا کو باوجود ہر طرح کی ناسازگاری
کے صحت مند نہیں تو اعتدال پہ قابو میں رکھ سکی۔ شاید یہ کہنا غلط نہ ہو کہ سیاسی مناقشوں کے سبب سے
اکثر صوبوں میں گورنر حکومت کی نوبت آتی رہی اور آتی رہتی ہے لیکن ذاکر صاحب جب تک بہار کے گورنر
رہے وہاں کی وزارت یا پارٹی کے توازن میں کوئی قابل لحاظ انتشار یا اختلال رونما نہیں ہوا۔ یہ کوئی معمولی
بات نہ تھی اس لیے کہ گورنری سے سبکدوش ہو کر نائب صدر کے فرائض سنبھالنے دہلی آ گئے تو کچھ ہی دنوں
بعد بہار کی وزارتی حکومت اس طرح زیر و زبر ہونے لگی اور ایسی ایسی ناشدنی اور ناگفتنی منظر عام پر آتیں
کہ تعجب ہوتا تھا کہ ایسا بھی ہو سکتا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ذاکر صاحب نے کیسے مرحلے پر قدم جما رکھے
تھے کہ قدم اٹھاتے ہی ایسا معلوم ہونے لگا جیسے آگ ہی اگلنے والے پہاڑ نہیں ہوتے۔ گراوٹ اور گندگی کی

اگلنے والے پہاڑ بھی ہوتے ہیں!

پنڈت جواہر لال نہرو کی وفات پر اپنے ایک مضمون پر عرض کیا تھا کہ دہلی اتنا بڑا اور بے قابو شہر ہو گیا ہے اور اس میں ایسے ایسے غیر متوقع حالات و حادثات ہر وقت پیش آتے رہتے ہیں کہ وہاں جانے میں خاصا پس و پیش ہوتا ہے جیسے کسی ڈراؤنے بے کراں جنگل میں گم ہو گیا ہوں جہاں پرسان حال کوئی نہیں۔ جان مال آبرو سب خطرے میں! لیکن اس وقت حکومت کے اعلیٰ ترین مناصب پر فائز ہیں ایسی عظیم ہستیاں تھیں جن کے ہوتے ہوئے دل کو ڈھارس رہتی تھی کہ کوئی حادثہ پیش نہ آئے گا۔ دوسرے یہ کہ اس وقت دنیا کی زیادہ سے زیادہ ترقی یافتہ اور طاقتور حکومت یا ملک کی عنان بھی ایسے بے داغ، بے لوث اور معتبر ہاتھوں میں نہ تھی جیسی کہ جمہوریہ ہند کے ان اکابر کے ہاتھوں میں۔ جیسے کہ ڈاکٹر رادھا کرشنن صدر، پنڈت جواہر لال نہرو وزیر اعظم اور ذاکر صاحب نائب صدر! تمام امور کو پیش نظر رکھتے ہوئے کون نہیں جانتا کہ ذاکر صاحب کے صدر حکومت رہنے سے ملک، حکومت اور دار الخلافت تینوں کی کیسی غیر متزلزل ساکھ تھی۔ سیاسی پالیسی کے تعین اور نظم و نسق کے تقاضوں کے اعتبار سے صدر مملکت محض آئینی صدر ہوتا ہے اور نارمل حالات میں وہ کوئی غیر معمولی اقدام نہیں کرتا۔ ایسے صدر کا بڑا اہم رول یہ ہے کہ اس کی ذہنی اور اخلاقی برتری ایسی ہو کہ وہ ملک کے اندر اور باہر حکومت کا ضمیر سمجھا جائے۔ ذاکر صاحب میں یہ صفت بیش از بیش تھی جہاں تک امور مملکت یا سیاسی پارٹیوں کے مزاج و مصلحت کا تعلق ہے میرے معلومات کتنے ہی ناقص یا نامکمل کیوں نہ ہوں۔ لیکن ذاکر صاحب کے بارے میں اتنا جانتا ہوں کہ پارٹیوں، اعیان حکومت اور عامۃ الناس کو ذاکر صاحب کے علمی و اخلاقی فضائل، دیانت و امانت، ہوشمندی، ہمدردی اور شرافت و انسانیت کا جیسا صحیح اور براہ راست احساس و اعتراف تھا وہ اپنی نظیر آپ ہے!

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے صدر مملکت کی حیثیت سے اپنے پالیسی اور ملک کے اندرونی یا سیاسی مسائل میں دخل دینا یا ان پر گفتگو کرنا ذاکر صاحب کے لیے نہ مناسب تھا نہ ممکن لیکن سیاست کا دائرہ یا مفہوم اتنا ہی نہیں جتنا بالعموم سیاسی پارٹیوں کے کارنامے میں کم ان کے کرتوت میں زیادہ ہر روز دیکھنے میں آتا رہتا ہے۔ سیاست کا ایک پہلو وہ بھی ہے جہاں ملک کے وقار و استواری کو نظر میں رکھتے ہیں یہی وہ مقام ہے جہاں سیاست اور دین (راستی و اخلاق) کو یک جا یا ایک دوسرے سے قریب رکھنے یا نہ رکھنے کا مرحلہ آتا ہے، اور یہ بڑا مشکل مقام ہے، جہاں تک میرے سمجھنے اور آپ کے ملنے کا تعلق ہے! ذاکر صاحب کا سیاست سے براہ راست لگاؤ نہ تھا لیکن اس کے پیچ و خم اور داؤ پیچ سے بخوبی واقف تھے۔ بیشتر بڑے آدمی ایسے ہوتے ہیں یا یں ہمہ ایک اعلیٰ شخص اور معلم (مصلح) ہونے کے سبب سے وہ سیاست

اور سیاست گری کے رخ ورفتار اور وسیلہ و مقصد کو متوازن اور صحت مند رکھنے کا اپنے کو ذمہ دار سمجھتے تھے۔ اس ذمہ داری کو وہ خارجی وسائل سے نہیں صرف اپنی شخصیت کی بڑائی سے پوری کرتے رہتے تھے۔ اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ غیر ذمہ دار اشخاص شخصیت کی اتنی پروا نہیں کرتے جتنی شخصیت کی تاوقتیکہ وہ کسی نفسیاتی علت کا شکار نہ ہوں۔ صدر مملکت کی حیثیت آئینی طور پر کچھ بھی ہو، اخلاقی اعتبار سے وہ ملک اور قوم اور ان سے آگے بڑھ کر ضمیر انسانی کا امین و آئینہ دار ہوتا ہے۔ اس رول کو اسے ادا کرنا پڑتا ہے۔ یہ اپنے کسی علم کے زور پر نہیں کہہ رہا ہوں اس لیے کہ علم اور زور دونوں اعتبار سے نیاز مند واقع ہوا ہوں بلکہ ذاکر صاحب کے سانحۂ رحلت کے بعد کانگرس کے ڈسپلن میں جیسی المناک ابتری آئی اور حکومت کو جس طرح کی نزاکتوں کا سامنا ہوا اس کے پیش نظر خیال آتا ہے جیسے ذاکر صاحب اپنی جگہ پر موجود ہوتے تو اس کی نوبت نہ آتی۔ بہار کا قصہ سنا چکا ہوں۔

کسی محکمے، کارخانے یا ادارے کی کامیابی اور نیکنامی کا مدار، اس کے قانون، ضابطہ یا عملے کی تعداد اور اختیارات پر اتنا نہیں ہے جتنا اس کے اراکین کی دیانت داری، فرض شناسی، دلسوزی، محنت، اور اہلیت پر ہے۔ آج کل کے اداروں، محکموں اور دفتروں کو دیکھیے سب جانتے ہیں کہ ان میں کام کرنے والوں اور حاصل کار کا تناسب کیا ہے۔ ہر طرف ہر سطح پر ہر مواخذے سے بے نیاز جیسا کرپشن[۱] CORRUPTION رشوت خوری، گراوٹ، گندگی، حرام خوری، جس شدت سے جس پیمانے پر پھیلا ہوا ہے اس نے زندگی کو ایک اعلیٰ درجے کی ذمہ داری ہونے کے بجائے کرب و کراہت کی علامت بنا دیا ہے۔ دامن کی پاکی کا کون چھیڑے اور کون آگے بڑھائے، جب بڑا گنہگار اپنے بند قبا کو دیکھ کر چھوٹے گنہگار کے دامن کو دیکھنے جرأت نہ کرسکتا ہو۔ کوئی مانے یا نہ مانے جب ابتری عام ہو اس وقت ایک اچھا اور بڑا شخص تنہا وہ کرسکتا ہے جو فوج، پولیس، الکشن، کانفرنس، یوتھ فسٹول، طالب علم اور سادھو علیحدہ علیحدہ اور مل کر بھی نہیں انجام دے سکتے۔ اصلاح و امن کے کاموں کے لیے اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ ایک پیغمبر بھیجا ہے، افواج کبھی نہیں بھیجیں۔ ملک کے اعتبار و وقار کی بازیافت کے لیے ابھی ذاکر صاحب کی ضرورت تھی۔ شاید ایک سے زائد کی!

ملک ہو، قوم ہو، ادارہ یا انجمن ہو ان سب کی وقعت و اہمیت کا اندازہ بالعموم اس کے سربراہ

---

[۱] انگریزی کے دو الفاظ کرپٹ اور کرپشن کو اردو ہی نہیں ہندوستان کی تمام دوسری زبانوں کو بے تکلف قبول کرلینا چاہیے جن میں سبھی مبتلا ہوں اس کے سمجھنے یا مقبول عام ہونے میں کتنی دیر لگتی ہے۔

کی وقعت اور اہمیت سے لگاتے ہیں جو وقت آنے پر بڑی سے بڑی آزمائش یا بڑے سے بڑے شخص کے سامنے اپنے اخلاقی، علمی اور تہذیبی فضائل کی بنیاد اور بلندی پہ کھڑا ہو سکتا ہو اور ملاقاتی یا مہمان واضح طور پر محسوس کرے کہ وہ میزبان کی بڑائی کا اعتراف کیے بغیر اپنی بڑائی نہ خود محسوس کر سکتا ہے نہ کرا سکتا ہے اس طرح کے مواقع بالعموم اعلیٰ دانش گاہوں میں پیش آتے ہیں جہاں طلبا اور اساتذہ دونوں اپنے سردار کے قد و قامت کو مختلف پہلوؤں سے برابر پرکھتے رہتے ہیں۔ ان دونوں سے زیادہ شخصیت کا بے لاگ اکثر بے رحم پارکھ کوئی دوسرا نہیں ہوتا۔ ذاکر صاحب جہاں جہاں اس مرحلے و منزل سے گزرتے رہے اور ہمیشہ ہر جگہ اس کا اعتراف کیا گیا کہ ہر محفل میں اور ہر محاذ پر ان کا قد سب سے نکلتا ہوا پایا گیا بسا کہ کاروار شخص پر ہوتا ہے منصب پر نہیں۔ ذاکر صاحب کے عہد میں بڑے بڑے مواقع پر باہر سے آنے والے خواہ وہ کتنے ہی ممتاز کیوں نہ ہوں سب سے پہلے ذاکر صاحب کی خدمت میں اپنا ہدیۂ عزت و عقیدت پیش کرتے۔ طلبا کا اچھے سے اچھے الفاظ میں ذکر کرتے اور برابر اس کا لحاظ رکھتے کہ وہ ہندوستان کی ایسی تاریخی و مرکزی دانشگاہ میں آئے ہیں جو ہر اعتبار سے قابل لحاظ اقلیت کے تعمیری و تہذیبی حوصلوں، دوستداری اور وسیع المشربی کا بڑا مبارک و مقبول نمونہ ہے۔ یوں بھی اصطلاحاً ہم پر اقلیت کا جا ہے جتنا اطلاق ہوتا ہو جہاں تک اس اقلیت کے علمی، تمدنی، تہذیبی اور انسان دوستی کا تعلق ہے وہ اکثریت سے پیچھے نہیں ہے۔ شاید ہندوستان سے باہر کی اکثریت سے بھی۔

یہاں مقصد یہ ظاہر کرنا تھا کہ ذاکر صاحب کی جامع حیثیات شخصیت ایسی تھی کہ وہ حکومت کے ان مسائل مہمہ کو بھی سلجھا یا ان کو صحیح خطوط پہ رکھ سکتے تھے جو آئین کی رو سے ان کے اختیارات سے باہر تھے۔ قوم اور ملک کے سب سے بڑے سربراہ میں یہ صفت موجود ہو تو ہر تعصب و تنگ نظری سے بلند ہو کر فخر کرنا چاہیے۔ ایک مشہور قول ہے "مرنے سے پہلے مر جاؤ" اس کی ایجابی و تعمیری تعبیر یہ ہے کہ پانے سے پہلے پا لو" ذاکر صاحب نے یہی راستہ اختیار کیا تھا۔ وہ ہر منصب پر فائز ہونے سے پہلے اس پر فائز ہو چکے ہوتے تھے یعنی اس عہدہ کے لیے جیسے اخلاقی، علمی اور تہذیبی اوصاف کی ضرورت ہوتی اسے مدتوں کے ریاض سے اپنا چکے ہوتے تھے۔ نظر برآں یہ کہنے میں تامل نہیں کہ صدر مملکت ہونے سے پہلے وہ صدر مملکت بن چکے تھے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ زندگی نے وفا کی ہوتی تو وہ صدارت کے منصب سے سبکدوش ہو کر بھی صدر رہتے! ذاکر صاحب کے ان اوصاف کو مدنظر رکھیں تو یہ سمجھنا دشوار نہیں کہ وہ محض اپنے کردار سے ملک کے وسیع اور بہترین مقاصد کو روبراہ کرنے اور رکھنے میں معین ہوتے تھے ہندوستان جیسے اخلاقی اقدار و روایات اور تاریخی و تہذیبی تنوع و تضاد کے ملک میں صدر مملکت کا کردار

ایسا ہی ہونا چاہیے جس کے آگے ہر کرتوت کو جھکنا پڑے!

نائب صدر اور صدر مملکت ہونے کی حیثیت سے انھوں نے بہت سے بیرونی ممالک کا دورہ کیا تھا اور وہاں کے اعاظم و اکابر سے متعارف ہوئے تھے۔ ظاہر ہے اس طرح کی دید و بازدید معینہ ضوابط کی تحت ہوتی تھی عقل اس کو باور نہیں کرتی کہ ملکوں اور حکومتوں کے صناد ید عظام اعلیٰ ترین سطح پہ ایک دوسرے سے ملتے ہوں اور بقول سرسید صرف یہ کہہ یا سن کر ایک دوسرے سے جدا ہو جاتے ہوں "کیوں صاحب آپ جنگل کو انڈے کھاتے ہیں یا نہیں"! اتنے بڑے لوگ ملتے ہوں گے تو معرض بحث میں نہیں تو معرض گفتگو میں کچھ بڑی باتیں بھی ہوتی ہوں گی۔ یہ اور بات ہے کہ معرض تحریر میں نہ لاتے ہوں۔ زندگی اور زمانہ جن منجدھار سے گذر رہا ہے اور جیسی جیسی نزاکتوں اور پیچیدگیوں کا انسان اور انسانیت کو سامنا ہے ان پہ کچھ نہ کچھ گفتگو آتی ہو گی چاہے ان کی حیثیت تمام تر علمی اور انفرادی ہو۔ ذاکر صاحب جیسے صاحب اخلاق و کردار، دانشور، ذہین و ذکی، بیش از بیش علوم سے باخبر، راستی، پاکیزگی اور خوبصورتی کے دوستدار، خیر و خدمت کے نمائندہ اور پیامبر، تحریر و تقریر میں بے مثل، گفتگو میں شائستہ و شگفتہ، مباحثہ و مذاکرہ میں ناقابل تسخیر، زندگی اور زمانے کے خیر و شر سے خبردار، ہر محفل میں مقبول، ہر عادت پہ محترم، جس کی دردمندی ہر زخم کا مرہم اور جس کی دلجوئی ہر مایوسی و مظلومی کا مداوا تھی، ان کا سامنا کسی مسئلے یا محاذ پر دنیا کے ائمہ و اکابر سے ہوتا ہو گا تو کیسا محسوس کرتے ہوں گے جب ان کو رفتہ رفتہ معلوم ہوتا ہو گا کہ جو بات معرض گفتگو میں ہے اس کا آخری لفظ کہنے والے ذاکر صاحب ہی ہوں گے! ذاکر صاحب اور علم و فن کے بڑے بڑے ماہرین کو بارہا سرگرم گفتگو دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ اوروں کو بھی ہوا ہے۔ سب کا فیصلہ یہی ہے کہ قول فیصل ذاکر صاحب ہی کے حصہ میں آتا تھا یہی نہیں جہاں ذاکر صاحب ہوتے وہاں ہر مباحثہ و مذاکرہ کا افتتاح و اختتام شادمانی و شگفتگی کی فضا پہ ہوتا۔

ذاکر صاحب مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ اسی زمانے میں مجھ پہ قلب کا دورہ پڑا۔ میں بڑی بڑی بیماریاں اٹھائی ہیں۔ ایک سے ایک نازک اور تکلیف دہ آپریشن کرائے اور مدتوں ان عذاب جھیلے ہیں لیکن اس قدرت سے اور راضی برضا رہ کر جیسے زندگی کے سفر میں یہ مرحلے خوش و ناخوش گذار دینے یا گذر جانے ہی کے لیے آتے ہوں۔ لیکن کس قیامت کے درد و کرب کا تھا کا دورہ تھا۔ بار سے وہ درد اور دور دونوں دور ہوئے لیکن کیا چھوڑ گئے وہ بھی ناقابل بیان

ذاکر صاحب دیکھنے آیا کرتے تھے۔ میرے کمرے کا دروازہ اس رخ سے ہے کہ چارپائی پر لیٹے ہوئے بیرونی دروازے تک تقریباً ڈیڑھ سو فٹ تک آتے جاتے ہوئے لوگوں کو دیکھ سکتے ہیں۔ ذاکر صاحب حسب معمول سپید کھدر کے نہایت ستھرے اور خوش قطع لباس میں باغ پر نظر ڈالتے ہوئے، ہموار مضبوط قدموں سے نہ جلد جلد نہ آہستہ آہستہ بالکل اسی طرح جیسے ہمیشہ چلتے تھے آتے ہوئے نظر آتے۔ کتنا مردانہ دلکش شریفانہ سراپا تھا اور کیسی امید، وقار اور ہمدردی کی فضا اور دعوت بکھیرتے ہوئے آتے تھے ان میں انسانیت، علم، ذہن، فطرت سب کا حُسن اکٹھا ہو گیا تھا۔ ان کی موجودگی میں تمام دوسرے حسن اضافی معلوم ہونے لگتے تھے۔ یوں بھی انسان سے زیادہ خوبصورت کون ہوا ہے۔

عام تیمارداروں سے ان کا انداز بدلا ہوا نہ تھا بالکل شخصی اور انفرادی جیسا کہ ذاکر صاحب ہی کا ہو سکتا تھا۔ نہ خواہ مخواہ ہنستے بولتے ہوئے کمرے میں داخل ہوتے نہ تسکین و تشفی یا تفریح و تماشے کے بندھے ٹکے کلمے زبان پر لاتے۔ نہ علاج معالجہ۔ ڈاکٹروں کی آمد و رفت یا کھانے پینے کے بارے میں کوئی گفتگو نہ کرتے۔ چہرے کو نہ متفکر بنانے نہ ہونے دیتے۔ بس آتے اور بغیر کسی تکلف یا تصنع کے چارپائی سے متصل تخت پر گاؤ تکیے کا سہارا لے کر بیٹھ جاتے۔ جیسے تیمارداری کا فریضہ ادا کرنے کے لیے نہیں بلکہ تمام کاموں سے فارغ ہو کر خوش وقت ہونے اور خوش وقت کرنے کے لیے آئے ہوں۔ بالکل جس طرح نارمل حالات میں تشریف لایا کرتے تھے۔ بہت بے قرار ہوتے تو تخت چھوڑ کر چارپائی کی پٹی پر بیٹھ جاتے اور میرا ہاتھ اپنی دونوں ہتھیلیوں میں لے کر دھیرے دھیرے دبانے لگتے۔ ایک لفظ نہ کہتے لیکن چہرے سے ایسا معلوم ہوتا جیسے امید اور آرام کی بشارت دے رہے ہوں۔ اس سے اسی طرح کی تسکین ملتی جیسے کوئی زود اثر مسکن دوا TRANQUILISER دی گئی ہو۔ خدا کے جس اچھے بندے کو اپنے رب کا کلام سن کر بیماری کی شدت میں تسکین مل جاتی ہو اور جس نے قاتلوں کے جم غفیر میں اللہ اور اسلام کا برملا اقرار کر کے جام شہادت پینے کا حوصلہ دکھایا، اسی کی ہتھیلی کے لمس میں یہ تاثیر مل سکتی تھی۔ جب تک وہ زندہ رہے یہ بات یاد نہ آئی۔ آج جبکہ وہ آسودۂ رحمت ہیں پچھلا سماں آنکھوں کے سامنے ہے۔ گریہ اُٹھتا ہے، آنسو امنڈ آتے ہیں اور سانس میں گرہیں لگتی معلوم ہوتی ہیں اور سوچنا اور لکھنا ناممکن معلوم ہونے لگتا ہے ...... اسی دوران میں عید آگئی۔ صحت اب سنبھل گئی تھی۔ نماز پڑھ کر سیدھے میرے یہاں پہنچے اور تخت کے بجائے چارپائی ہی پر بیٹھ گئے۔ اس وقت ان کے چہرے پر شادمانی کی وہ شبنم تھی جس میں صبح کی تازگی اور سورج کی اولین کرنوں کی الماس پاشی ملتی ہے۔ جیب سے ایک لفافہ نکالا۔ اس میں سے ہاتھی دانت کا بڑا خوبصورت ورق تراش، کتاب میں رکھنے کا نشان، چھوٹے چھوٹے ٹنکے ہوئے پھول پتیاں اور چند رنگین کارڈ جن پر مشہور عالم مصوروں کے شاہکار چھپے ہوئے تھے

ایک ایک کرکے اس انداز اور اپنے الفاظ کے ساتھ جن میں محبت، تفریح اور تکریم کی ناقابلِ بیان کیفیت تھی نکال کر دیے۔ ایسا محسوس ہوا جیسے عید کے دن ان تحائف کے ساتھ یہ مژدہ بھی دے رہے ہوں جیسے دکھ اور درماندگی کے دن دور ہوئے اور خدا نے مشکل آسان کردی۔

ذاکر صاحب کو بیشتر چھوٹے بڑے لوگوں نے ہر حال میں دیکھا ہے۔ قرول باغ سے لے کر راشٹرپتی بھون تک کی ان کی رہن سہن سب کے سامنے ہے۔ انھوں نے اپنی زندگی کو ایسے سیدھے اور سچے راستے پر ڈال دیا تھا کہ بدلے ہوئے حالات میں بھی ان پر نظر ثانی کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی بلکہ بدلے ہوئے حالات ہی کو ذاکر صاحب کے اختیار کیے ہوئے راستے پر آنا پڑا۔ عام طور پر لوگ ہوا کے رخ کو دیکھتے ہیں اور اسی کو اختیار کر لیتے ہیں۔ ذاکر صاحب ان عظیم شخصیتوں میں تھے جن کو دیکھ کر کبھی کبھی ہوا کو اپنا رخ بدلنا پڑتا تھا۔ وہ جن اعلیٰ صفات سے متصف تھے وہ ان میں اس طرح رچ بس گئے تھے کہ وہ جہاں ہوتے جس حال میں ہوتے ہمیشہ علم، عافیت اور عزت کے پیامبر نظر آتے۔ زندگی کے حسن و قبح کے پرکھنے میں زیادہ تر شخص کی رہن سہن، کھانے پینے، اوڑھنے پہننے، میل ملاپ، فکر و نظر اور خیر و خدمت کے طور طریقوں کو مدنظر رکھتے ہیں۔ ذاکر صاحب قرول باغ کے جس معمولی و مختصر مکان میں رہتے تھے وہ کسی اعتبار سے قابلِ لحاظ نہ تھا اور آبادی و آبادکاری کے فشار میں اب تک گھس پس نہ گیا ہو تو کیا عجب لیکن اس کو اندر سے ایسا بنا رکھا تھا جس میں سرور، راحت، آرام اور خوبصورتی کی ہر چیز تھی اور سب سے بڑی بات یہ تھی جو بہ مشکل کہیں نظر آئے گی کہ کوئی چیز بے قرینہ نہیں تھی۔ ایسے مکان میں بے تکلف کسی وقت بھی بڑے سے بڑے آدمی کی پذیرائی کی جا سکتی تھی۔ قرینہ اور بے قرینہ کا صحیح تصور مہاتما گاندھی کے اس قول سے کیا جا سکتا ہے کہ ہر وہ چیز DIRT (کوڑا یا گندگی) ہے جو اپنی جگہ پر نہ ہو یعنی بے قرینہ رکھی ہو۔ میں نے ذاکر صاحب کے یہاں قرول باغ اور جامعہ نگر میں جتنا خوش ذائقہ اور ستھرا کھانا کھایا ویسا ان کے سرکاری دسترخوان پر نہ ملا۔ برتن۔ دسترخوان اور آس پاس کی صفائی اور خوشنمائی کا التزام اس سے کچھ زیادہ ہی دیکھا جتنا ان حالات میں کوئی بھی قرول باغ یا جامعہ نگر میں رکھ سکتا تھا۔ پھر اسی دسترخوان پر خلوص، خوش دلی اور خوش وقتی کی وہ فضا جسے ذاکر صاحب ہی جیسا میزبان فراہم کر سکتا تھا۔

کسی کو کھانا کھاتے دیکھ کر آسانی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ شخص کس قماش کا ہے اس لیے کہ کھانے کے آداب زندگی کے دوسرے آداب سے جداگانہ نہیں ہوتے۔ زندگی کے ڈھکے چھپے جتنے وظائف ہیں وہ سب ایک دوسرے سے مکمل طور پر مربوط ہیں۔ ایک میں بھی جھول ہوگا تو اونٹ ہی نہیں [illegible]

کی بھی کوئی کل سیدھی نہ ملے گی۔ یہ ناممکن ہے کہ کوئی شخص دسترخوان پر پھوہڑ ہو اور جانماز پر نہ ہو۔ کھیل کے میدان میں کھوٹا ہو اور کاروبار میں کھرا ہو۔ علی گڑھ میں کچھ لوگوں کو رات کے کھانے پر مدعو کیا تھا۔ چند مہمان باہر کے آئے ہوئے تھے، کچھ یونیورسٹی کے اور دو تین حکام ضلع تھے۔ اتفاق سے مجھے جن صاحب کے قریب جگہ ملی وہ کھانے پینے کے تمام وظائف بالجہر ادا کرتے تھے اور اس تدید سے پن سے کھا رہے تھے جیسے زندگی میں ایسا موقع نہ پہلے کبھی ملا تھا نہ آئندہ ملے گا۔ کھانے میں چپڑ چپڑ کرنا، پینے میں سڑ پینا، پانی غٹ غٹ پینا، ڈکار لینا اور چاول اور شوربہ یا سالن کو ملا کر ہاتھ سے کھانا اور سنی ہوئی انگلیوں کو پلیٹ میں بار بار جھٹکنے اور چاٹنے یا ہڈی کی نلی میں سے گودا نکالنے کے لیے ہاتھ پر ہاتھ ٹھوکنے یا بار بار منھ میں ڈالنے نکالنے سے مجھے بڑی گھن آتی ہے اور کھانے کی تقریب عذاب بن جاتی ہے۔ میرے ہم نشین یہ سب کر رہے تھے۔ کسی طرح کھانے اور کافی کا دور ختم ہوا۔ میز پر سے لوگ اٹھ گئے تو ٹہلتے ہوئے آئے اور میرے بازو پر ہلکے سے ہاتھ رکھتے ہوئے مسکرا کر بولے "آپ کو کھانا اچھا ملا ہو یا نہیں، ساتھی اچھا ملا تھا!"

ذاکر صاحب کھانے کے آداب جس طرح ملحوظ رکھتے تھے اور جس نفاست سے اس کو ادا کرتے تھے وہ بالکل ایسا معلوم ہوتا جیسے کوئی بڑا فن کار مثلاً مصور، مغنی یا سرجن اپنے فن کا حق ادا کر رہا ہو۔ راشٹرپتی بھون میں بھی ذاکر صاحب کے دسترخوان پر کھانا کھانے اور ایک آدھ دن وہاں بسر کرنے کا اتفاق ہوا۔ قصر صدارت کی شان و شوکت، امارت و اقتدار کی فضا، خورد و نوش کے ساز و سامان، دسترخوان سے متعلق عملہ اور ان کے آداب کا ایک عالم ہوتا۔ بایں ہمہ محسوس ہوتا کہ یہ سب اپنی قدر و قیمت صاحب محفل کی شخصیت سے اکتساب کر رہے ہیں۔ یہاں یہ حقیقت بھی فراموش نہ کرنا چاہیے کہ ہر صاحب محفل، صاحب محفل نہیں ہوتا۔ سرخوبی و زیبائی منصب نہیں شخص اور شخصیت کی خوبی و زیبائی کی محتاج ہوتی ہے۔ جو شخص یا شخصیت اپنے امتیاز و اعتبار کے لیے کسی عہدہ یا منصب کی محتاج ہو وہ ساقط الاعتبار ہے۔ جہاں ذاکر صاحب کا ہیچ ہو وہاں سے ان کو جدا کر کے دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ باقی کیا رہ جاتا ہے۔ مجنوں کے نکل جانے سے جنگل ہی نہیں اداس ہو جاتا بستی اور بھی زیادہ اداس ہو جاتی ہے۔ لعل و گوہر کی قیمت اور وقعت گوہر فروش کی دوکان میں نہیں عقد گردن خوباں میں کھلتی ہے۔

نئی دہلی اور وائسرائے ہاؤس (راشٹرپتی بھون) سر ایڈورڈ لٹینس (SIR EDWARD LUTYENS) اور جین ٹیلر (JANE TAYLOR) کے خون جگر کی نمود ہیں۔ وہ خون جگر جس کی طرف اقبال نے اشارہ کیا یعنی "فن کار کے ہنر و حوصلہ، جسم و جاں، ذہن و ذوق اور عبادت و ریاضت کا افشردہ یا کشید۔ ان فنکاروں کو جو دیکھے گا ہمیشہ اور غیر شعوری طور پر ان کو ظہور و وجود میں لانے والے حضور میں اپنی عقیدت کا

ہدیہ پیش کرے گا لیکن جیسا کہ ابھی ابھی کہا گیا ہے مکان کو شرف مکین سے ہے۔ سینا اور صلیب کی تمام تر منزلت موسیٰ اور مسیح سے ہے۔ جامعہ کے ابتدائی دور کا نقشہ، قرول باغ کے خرابے یا مزبلے میں بہت قریب سے دیکھا ہے۔ اسی طرح قصر سلطانی (راشٹرپتی بھون) بام و در شان و شوکت۔ گل و گلزار، ساز و سامان نقش و نگار اور خدم و حشم بھی نظر میں ہیں۔ دونوں مقامات پر ذاکر صاحب کی شخصیت کے تصرف کا عالم جدا تھا۔ کتنا واضح، کتنا بامعنی و مقصد، کتنا قیمتی و عجیب! شاید اسی طرح کی کیفیت نے اصغر گونڈوی سے یہ شعر کہلوایا تھا ؎

فروغِ حسن سے تیرے چمک گئی ہر شے ادائے رسمِ بلالی و طرزِ بو لہبی!

ذاکر صاحب بڑے فکرمند اور کوشاں رہتے تھے کہ جامعہ کے ہائی سکول کے امتحانات کو سرکاری محکمہ تعلیم تسلیم کرے۔ اسی زمانے میں یا اس کے آس پاس سارجنٹ اسکیم شائع ہوئی تھی جس کا بڑا شہرہ تھا اور جا بجا اس کی تبلیغ کی جا رہی تھی۔ اس سے پہلے واردھا تعلیمی رپورٹ منظر عام پر آ چکی تھی۔ مسٹر سارجنٹ اور ان کے رفقا جامعہ ملیہ کو ترتیب اور تفصیل سے دیکھنے گئے۔ ہفتہ عشرہ بعد ذاکر صاحب علی گڑھ تشریف لائے۔ نہایت خوش و خرم۔ ان کی شادمانی بھی دیکھنے کی چیز ہوتی تھی بالخصوص جامعہ سے اور جامعہ کے ابتدائی دور سے متعلق۔ جیسے ان میں فنون لطیفہ کی تمام رعنائی اور تہذیب و اخلاق کی گرانمائگی سمو دی گئی ہو۔ پوچھا ذاکر صاحب جامعہ میں سارجنٹ صاحب پر کیا گزری۔ خوش ہو کر کہا، وہ جامعہ کے مقاصد، نظم و نسق، نصاب، معیار اور پروگرام سے بہت مطمئن اور خوش ہوئے۔ میں نے دریافت کیا، یہ تو بتایئے سارجنٹ صاحب کو جامعہ سے متعلق تمام باتیں دکھانے سمجھانے کے لیے ساتھ کون تھا۔ بولے "کیا مطلب، میں تھا!" میں چپ ہو گیا۔ چونک کر بولے "نہیں نہیں کچھ فرمایئے" ذاکر صاحب کا چیلنج کا یہ انداز بڑا پر لطف ہوتا تھا۔ ان کے بعض قریب ترین عزیزوں میں بھی یہ جھلک ملتی ہے۔ عرض کیا کہ جب آپ ہی دکھانے بتانے والے تھے تو ظاہر ہے غریب کو اپنی قوت ممیزہ اور قدرت فیصلہ کو کام میں لانے کی کہاں تک سکت رہی ہوگی۔ آپ نے اسے قرول باغ (اس وقت کا) دکھا کر بتا دیتے کہ یہ ازہر یا آکسفورڈ ہے تو وہ کہتا آمنا و صدقنا! ذاکر صاحب ہنس دیے۔ یہ مبالغہ نہیں ہے جہاں ذاکر صاحب معرض گفتار میں آئیں وہاں باطل تھا دعویٰ ہمسری کا!

بے داغ اور بے شکن سفید کھدر کی ٹوپی، شیروانی اور پاجامہ میں ملبوس ذاکر صاحب نہایت دلکش نظر آتے تھے، یوں بھی بڑے خوش شمائل اور جامہ زیب تھے۔ جہاں ہوتے خوشی اور خلوص کی فضا پیدا ہو جاتی اور پھیلنے لگتی۔ کھدر کے اوصاف کے بہت سے لوگ قائل ہیں، میں اس کو اس لحاظ سے خاص طور پر قابل احترام سمجھتا ہوں کہ یہ ایک عظیم روایت اور عظیم تر شخصیت کا نشان یا سمبل ہے جس نے ہندوستان کو اس کی اخلاقی روایات، ملکی اور قومی ذمہ داریوں اور عالمی تقاضوں سے آشنا کرایا۔ مجھے کھدر کی شیروانی اور پاجامہ زیادہ خوشنما معلوم ہوتا ہے۔ کھدر کا لباس دیر تک صاف ستھرا رکھا جا سکتا ہو یا نہیں، دیر تک صاف ستھرا نظر نہیں آتا۔ صاف و ناصاف سے قطع نظر ذاکر صاحب ہر روز کپڑے تبدیل کر دیتے تھے۔ ان کے لباس میں کبھی سلوٹ یا شکن نظر نہ آئی۔ میرا خیال ہے کہ ایسے لوگوں کو کھدر پہننے میں عجلت سے کام نہیں لینا چاہیے جن کی شکل اچھی ہو نہ اطوار!

کیا دن تھے اور کیسی باتیں جو اس وقت بے اختیار دے کے یاد آ رہی ہیں۔ ذاکر صاحب اور ان کے بھائیوں کی جائداد اور تعلیم کا انتظام مدتوں ان کے خالو صاحب کرتے رہے۔ ذاکر صاحب کہتے تھے کہ سال کے شروع میں وہ سفید موٹے کپڑے کے بے شمار کرتے پاجامے سلوا کر ایک خاص اسٹائل سے بھائیوں میں تقسیم کر دیتے۔ کالج کھلنے پر علی گڑھ آنے والے ہوتے تو بلاتے اور سامنے رکھے ہوئے کرتے پاجاموں کو ایک ایک کر کے گنتے اور دیتے جاتے۔ مقررہ تعداد پوری ہو جاتی تو کہتے اٹھا لو۔ ذاکر صاحب کہتے تھے کہ دینے کا یہ انداز خالو ہونے کا کم پٹھان ہونے کا زیادہ ہوتا تھا۔ یہ کوٹا کبھی نہیں بدلتا تھا البتہ ہم کو اختیار تھا کہ جب چاہیں اور جتنا چاہیں خالص گھی منگا سکتے تھے۔ اس کی شہادت اس وقت کے سارے ساتھی دے سکتے ہیں کہ ذاکر صاحب اس رعایت کا فائدہ جی بھر کے اٹھاتے تھے۔ جاڑوں میں صبح کے ناشتے میں، شب کی کھچڑی کے لیے جس کی دعوت عام تھی وہ خالو صاحب سے گھی ضرور منگاتے جو سیروں آتا۔ جلد سے جلد آتا اور بذریعہ ڈاک آتا۔ اس زمانے میں کچھ اور نہیں تو خالص گھی خارج از قیاس نہ تھا۔ محصول ڈاک منصفانہ اور شریفانہ تھا اور نہ ذاکر صاحب ہی نہیں دوسروں کے خالو بھی بات کے دھنی ہوتے تھے۔

ذاکر صاحب کو تمام عمر کرتہ ہی پہنتے دیکھا قمیص کبھی نہیں۔ اُن ہی روایتی آستین، گریبان اور جیب و دامن کے ساتھ جو اردو شاعری بالخصوص غزل کی ہزار شیوگی میں مسلسل اضافے کرتے رہتے ہیں۔ ذاکر صاحب نے اپنے کرتوں کی آستین گریبان اور دامن کے ساتھ چاہے جیسا سلوک کیا ہو اپنی جیب کی حرمت کا ہمیشہ خیال رکھا۔ داہنی طرف لٹکتا ہوا جس میں انھوں نے نہ کبھی ہاتھ ڈالا، نہ رومال رکھا نہ کنجی نہ کاغذ نہ پیسے نہ بیڑی! ظاہر ہے ایسی جیب میں کسی دوسرے کے ہاتھ کے لیے کیا ترغیب، اشارہ یا گنجائش ہو سکتی تھی۔ اتنے

حصے سے دھوبی کو بھی تعرض نہ ہوتا تو کیا عجب! ایم۔ اے۔ او کالج کا یونیفارم سیاہ ترکش کوٹ، ترکی ٹوپی، اوسط مہری کا سپید پاجامہ اور انگریزی جوتہ تھا۔ انگریز اساتذہ یونیفارم کی پابندی پر بہت زور دیتے تھے، خاص طور سے اس پر کہ جوتے پر تازہ پالش ہو، اوپر سے نیچے تک کوٹ کے سارے بٹن لگے ہوں اور لباس میلا ملگجا نہ ہو۔ کوٹ میں پورے بٹن نہ لگے ہوتے تو انگریز پروفیسر فوراً ٹوک دیتے۔ کالج سے یونیورسٹی ہوئی۔ پھر یہ پابندیاں رفتہ رفتہ اٹھ گئیں اور ایسی اٹھیں کہ یونیفارم کی پابندی درکنار رہی، پابندی کا تصور عدم پابندی رہ گیا ہے۔ ذاکر صاحب نے اس پابندی کو آخر تک نباہا۔ ان کی شیروانی کا ایک بٹن بھی کھلا ہوا نہیں پایا گیا۔ شیروانی اور ٹوپی بغیر ان کو شاید ہی کسی نے دیکھا ہو۔ ان کے جوتوں پر ہمیشہ تازہ پالش ملی۔ وائس چانسلری کا زمانہ تھا۔ لکھنؤ سے ایک صاحب ملنے آئے، شیروانی کے سارے بٹن کھلے ہوئے۔ صرف آخری نچلا بٹن لگا ہوا تھا۔ اودھ میں شیروانی پہننے کا اسٹائل بھی شاید یہی ہے۔ ملاقاتی رخصت ہو گئے تو مسکرا کر بولے، کیسی اوریجنل طبیعت پائی ہے۔ شیروانی کے تمام بٹنوں کا کام صرف ایک ناف سے لے لیا!

ذاکر صاحب کی وفات پر کسی نے رائے عامہ کا سروے تو نہیں کیا لیکن بڑے سے بڑے اور معمولی سے معمولی اشخاص سے پہلی بات جو سننے میں آئی وہ یہ تھی کہ اب مصیبت میں دلجوئی کون کرے گا اور دشواری میں صحیح مشورہ کون دے گا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی ہمدردی اور دانشمندی پر لوگوں کو کتنا بھروسہ تھا اور اس کا حلقہ کتنا وسیع تھا۔ بڑے ذی حیثیت اصحاب کو یہی کہتے سنا کہ ذاکر صاحب کی موجودگی سے بڑی تقویت تھی۔ کوئی مشکل آن پڑتی اور فیصلہ کرنے میں دشواری ہوتی تو ذاکر صاحب سے رجوع کرتے۔ وہ اس ہمدردی سے ایسی صائب رائے دیتے کہ مشکل آسان ہو جاتی۔ گورنر، وائس پریسیڈنٹ اور پریسیڈنٹ رہنے کے زمانے کے حالات مجھے زیادہ نہیں معلوم ہیں لیکن سننے میں یہی آتا رہا کہ ان اعلیٰ مناصب پر فائز ہوتے ہوئے اور ان کی پابندیوں کے باوجود وہ ملنے والوں کے لیے سہل یاب تھے۔ ان میں اتنی خوبیاں مجتمع ہو گئی تھیں کہ وہ مرجع خواص نہیں مرجع خلائق ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ اس کی مثال اس زمانے میں دیکھنے میں آتی تھی جب وہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ جتنی جلد اور غیر متوقع طور پر حالات بدلتے ہیں روایات نہیں بدلتیں۔ مسلم یونیورسٹی کی ہیئت و حیثیت جیسی کچھ رہ گئی ہو، اس کی حرمت کا احساس، اس کی اعلیٰ روایات سے وابستگی اور اس سے ہماری بہترین توقعات کا، البتہ ہونا وہی ہیں جو پہلے

کبھی تھیں۔ اُن تمام لوگوں نے جو ذاکر صاحب اور علی گڑھ دونوں کو عزیز رکھتے تھے اور مایۂ افتخار جانتے تھے ذاکر صاحب کو وہی جگہ دی جو ایم اے او کالج کے آنریری سکریٹری کو حاصل تھی۔ کسی کو کوئی دشواری کہیں پیش آتی وہ ذاکر صاحب سے رجوع کرتا۔ یہ مشکلات طرح طرح کی ہوتیں۔ ذاتی، سیاسی، علمی، نفسیاتی اور کبھی کبھی نفسانی بھی! اسٹاف، طلبا، چھوٹے بڑے ملازمین جب تک اپنی مشکلات لے کر ذاکر صاحب تک نہ پہنچ لیتے ان کی تشفی نہ ہوتی۔ اس میں وہ حق بجانب ہوتے اس لیے کہ بالآخر ذاکر صاحب ان کی تشفی کا کوئی نہ کوئی سامان کر دیتے۔

ذاکر صاحب کو جس طویل مدت تک جتنا قریب سے میں نے دیکھا سمجھا اور ان کا معترف و مداح رہا، شاید دوسروں کو ایسا اتفاق نہ ہوا ہو۔ لیکن یہ بھی جانتا ہوں کہ جن لوگوں کو ان کی رفاقت مجھ سے کم میسر رہی وہ بھی میری طرح ان کو عزیز و محترم رکھتے تھے جیسے ان سے مل لینا اور اعتبار و عزت کرنے لگنا ایک ہی بات ہو جس کے لیے زمان و مکان کی تخصیص و تحدید کی بالکل ضرورت نہ ہو۔ وہ ساتھی بندگانِ خدا کا حق اسی شوق، پابندی اور احساس ذمہ داری سے ادا کرتے تھے جس سے وہ خدا کے مقرر کیے ہوئے فرائض روزہ نماز وغیرہ ادا کرتے تھے۔ نماز روزہ کو میں نے یہاں شرعی یا اصطلاحی معنوں میں نہیں لیا ہے بلکہ اس کو ایک مکمل ڈسپلن سے تعبیر کیا ہے۔ انسانی زندگی کے تقاضوں کو اقدارِ اعلیٰ کی روشنی میں سمجھنے اور پورا کرنے میں جتنے واضح اور مکمل آداب و ہدایات نماز میں ملتے ہیں وہ بمشکل کہیں اور ملیں گے۔ مقررہ نماز پنج وقتی ہوتی ہے لیکن اس کی ڈسپلن ہمہ وقتی، ہمہ جہتی اور ہمہ گیر ہوتی ہے۔ ہماری تہذیب نفس اسی ڈسپلن کا عطیہ ہے۔ اگر یہ ڈسپلن پوری نہیں ہوتی تو نمازی کو سمجھ لینا چاہیے کہ احکامِ شرعیہ کے تقاضے پورے ہوئے نہ منشائے الٰہی کی تعمیل ہوئی۔ یہ باتیں میں نے نماز کے ماہرین نہیں بلکہ نماز کے محرومین کی طرف سے پیش کی ہیں اگر ان سے اتفاق نہ کیا جا سکے تو مجھے گردن زدنی نہیں بلکہ ناقابل التفات قرار دے کر بخش دینا چاہیے۔ ذاکر صاحب میں اس تہذیب نفس کی بڑی اچھی جلوہ گری ملتی تھی۔ وہ عالم، عامی، بوڑھا بچہ نوجوان، ذی حیثیت، کم حیثیت، امیر و غریب سب سے اس کی صلاحیتوں اور اس کے ذرائع اور وسائل کے مناسب حال ہمدردی کرتے اور جن تکالیف اور دشواریوں میں وہ مبتلا ہوتا اس کو اپنی تکلیف و دشواری سمجھ کر مشورے یا مدد سے حتی الوسع دور ورنہ ان کو کم کرنے کی فکر کرتے۔ غرض کیسی ہی ہو، کسی کی ہو اس کو پوری توجہ اور ہمدردی سے سننے اور مشورہ یا مدد دینے سے ذاکر صاحب کبھی نہیں اکتاتے تھے۔ زیادہ سے زیادہ غرض مندوں کی صرف سنتے رہنا اور نہ اکتانا میرے نزدیک کسی کے گور کے اندر خلد کا ایک در کھلنے کا موجب ہو سکتا ہے۔

ممکن ہے بعض اصحاب جو ذاکر صاحب سے اچھی طرح واقف نہ ہوں یہ خیال کرنے لگے ہوں کہ وہ زاہد خشک یا سادھو سنت قسم کے لوگوں میں سے تھے۔ اس کے بالکل برعکس ان جیسا ذہین طباع، فرین فہیم، شگفتہ رو اور شگفتہ خاطر، بے تکلف، رفیق و شفیق کم ملے گا۔ کبھی اور کہیں ایک بات آج سے بہت پہلے کہی تھی اسے آج یہاں دہرانا چاہتا ہوں کہ سفر ہو یا حضر، معرکہ ہو یا محفل، رنج ہو یا راحت تنہا ذاکر صاحب ساتھ ہوں تو پھر کسی دوسرے ساتھی کی ضرورت نہیں۔ خوبی اور خوبصورتی کا وہ ایسا مجموعہ تھے۔ عمداً یا سہواً کسی نے ان کی طنز و طباعی کی رگ کو چھو یا چھیڑ دیا اور ذاکر صاحب نے اسے قابل التفات سمجھا تو پھر مخاطب کو ایسا جھٹکا لگتا جیسے اس نے بجلی کا کھلا ہوا تار چھو لیا ہو۔ طنز و طباعی کے جیسے بر وقت و بے خطا حربے، انداز اور لب و لہجہ کے اختلاف کے ساتھ، مولانا محمد علی، عبدالرحمٰن صدیقی اور ذاکر صاحب کام میں لاتے تھے وہ میں نے کہیں اور نہیں دیکھے۔ گو جن کو میں نے دیکھا اور سنا ان کی تعداد کچھ زیادہ نہیں ہے۔ ذاکر صاحب کی یہ خصوصیت طالب علمی کے عہد سے لے کر آخر تک قائم رہی ورنہ بالعموم وہ نہایت دوستانہ اور شگفتہ موڈ میں رہتے تھے۔ شاید ہی کبھی کبیدہ خاطر یا مایوس نظر آتے ہوں۔ ایک لطیفہ کا ذکر بے محل نہ ہوگا۔

سنہ ۱۹۴۷ء کا زمانہ تھا۔ دہلی میں خونریزی اور سفاکی کا جو عالم تھا وہ کس کو بھولا ہوگا۔ مصیبت زدہ اور پناہ گزینوں کی خدمت اور خبر گیری کے لیے دن رات ذاکر صاحب دوا دوش میں رہتے۔ لیڈی ماؤنٹ بیٹن کے روزانہ کے پروگرام میں یہ بھی تھا کہ ذاکر صاحب کو ہمراہ لے کر غیر مسلم حلقوں میں بھی دریافت حال کے لیے جا نکلتیں۔ ذاکر صاحب ہی ترجمان ہوتے۔ کچھ دن بعد ملاقات ہوئی تو میں نے بڑے تردد سے پوچھا، ذاکر صاحب دہلی میں جو قیامت برپا تھی اس میں آپ کہاں کہاں پہنچتے رہے کچھ نہ کچھ تو آپ کی جان کا بھی آپ پر حق تھا۔ بڑے لطف سے فرمایا۔ کیا کرتا، بعد میں .. .. .. کہتے خواتین کا حق نہیں پہچانتا اور مولانا .. .. .. فرماتے خدا پر بھروسہ نہیں کرتا! ۔ اس میں جانِ سخن وہ دو نام تھے جو لیے تھے۔ جان ہی کے خیال سے یہاں ان کا اظہار نہیں کرتا!

میری آرزو یہ رہی ہے جو اب عادت بن چکی ہے کہ اچھی سے اچھی شے یا شخص علی گڑھ کا ہو، اچھی سے اچھی چیز علی گڑھ میں ملے اور ایسے ہی اشخاص علی گڑھ آئیں اور علی گڑھ کے ہو جائیں۔ کسی معقول اجنبی شخص بالخصوص نوجوان طالب علم سے ملاقات ہوتی تو اسے مشورہ دیتا جو کبھی کبھی اصرار کی حد تک پہنچتا کہ وہ ذاکر صاحب سے مل آئے۔ یہ اس بنا پر ہوتا کہ جب اس نوجوان نے مجھے اس درجہ خوش کیا ہے تو اپنی طرف سے ویسا ہی تحفہ بھی پیش کروں۔ یہ تحفہ اس کی ذاکر صاحب کی طرف رہنمائی ہوتی۔ آگے

ملِ کر ان اشخاص کو بھی مشورہ دینے لگا جو مذہب، معاشرہ، سیاست ہی سے نہیں خود ذاکر صاحب سے برہم و بیزار ہوتے۔ یہ لوگ ذاکر صاحب سے مل کر آتے تو بالکل بدلے ہوئے ہوتے جیسے انھوں نے ذاکر صاحب ہی کو نہیں اپنی اچھی صلاحیتوں کو بھی پا لیا ہو۔ لیکن یہ مشورہ جتنا نوجوانوں پر کارگر ہوتا اتنا ہی ان لوگوں پر بے اثر ہوتا جن کو اعلیٰ اقدار کو ادنیٰ اغراض پر قربان کر دینے کے لیے نفس کا ادنیٰ سے ادنیٰ مطالبہ کافی ہوتا ہے۔ کبھی یہ اور اتنا بھی نہیں۔ عموماً یہ وہ لوگ ہوتے جو اپنے کو مذہب سے جتنا قریب جتاتے مذہب ان سے اتنا ہی دور تر ہوتا۔ مذہب کی بڑائی کا ہمیشہ قائل رہا، ایسا نہ کروں تو اپنی کس خوبی پر بھروسہ یا فخر کر سکوں گا، لیکن اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ مذہب درہم اتنا کسی کو بناتا یا بگاڑتا نہیں جتنا اس کو بے نقاب کر دیتا ہے۔ کم سے کم آج کل کے مسلمانوں میں تو یہی دیکھنے میں آ رہا ہے بالخصوص ایسے مسلمانوں میں جو مذہب کے کاروبار نفع و نقصان کے خطوط پر کرتے ہیں۔ نفع اپنا، نقصان مذہب کا یا چاہے جس کا!

مجھے کسی خاص علم میں درک نہیں۔ اس علم و فن میں بھی جس کے طفیل اب تک روٹی اور عزت کمائی ہے لیکن کسی علم کے اسرار و غوامض سے قطع نظر اس کے بارے میں اتنا اندازہ لگا سکتا ہوں کہ عملاً وہ زندگی اور ذہن کے کن امور سے متعلق ہے مثلاً کمسٹری کے بارے میں موٹی سی ایک بات یہ جانتا ہوں کہ اس سے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر لینے کا کام لیا جاتا ہے یعنی ہر مرکب سے اس کے مفردات یا مشمولات کس طرح علیٰحدہ کیے جا سکتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ مذہب یا شخصیت بھی یہی کام انجام دیتی ہے۔ یعنی اگر کسی کی طبیعت اور طینت کا پتہ لگانا ہو تو اس کا سامنا کسی ایسے شخص سے کرا دیا جائے جو اقدارِ اعلیٰ کا امین و آئینہ دار (مردِ مومن یا مردِ حق) ہو۔ بڑی آسانی سے معلوم ہو جائے گا کہ شخص مذکور اپنی نہاد کے اعتبار سے اخلاقی فضائل سے ممتاز یا نفسیاتی اسقام میں مبتلا ہے۔ مؤخر الذکر ہر عبرت و عذاب کو جھیل سکتا ہے نہیں برداشت کر سکتا تو اچھے اور نیک نام شخص کو۔ اس طرح مردانِ حق کمسٹری یا کسوٹی ہوتے ہیں جس سے دوسرے پہچان لیے جاتے ہیں۔ احلانیات کے بھی اپنے علوم طبعی، علوم عمرانی اور کل پرزوں کا علم ہوتا ہے۔

ذاکر صاحب کی رحلت کے بعد اندازہ ہوا کہ کس کس سطح اور طبقے کے کتنے بے شمار لوگ تھے جو ان سے محبت اور ان کا احترام اس بنا پر کرتے تھے کہ ایسا کرنے سے وہ خود اپنے کو شایانِ محبت و احترام سمجھنے لگتے تھے۔ ذاکر صاحب قرول باغ میں جس معمولی حیثیت سے اپنے رفیقوں کے ساتھ جامعہ کے کاموں میں مصروف رہتے تھے اس کے بعد جن مراحل سے گزرتے ہوئے صدرِ مملکت کے درجے پر

پہنچے ہو گئے نہیں معلوم۔ لیکن جب وہ قرول باغ میں تھے اس وقت جتنے چھوٹے بڑے ان کی طرف بے اختیار کھنچتے اور جھکتے تھے اسی طرح آخری اور بلند ترین منصب تک وہ مرجع خواص و عوام رہے۔ ہر شخص ہر اعتبار سے ان کو معظم و مکرم جان کر ملتا تھا ؛ وہ اس طرح اور اس لیے ملتا تھا جیسے ملے بغیر رہ نہیں سکتا تھا، نہ یہ کہ ذاکر صاحب ان کے آقا یا حاکم تھے جس سے ان کی روزی، مرتبہ یا آبرو وابستہ تھی۔ کچھ اسی طرح کی بات ہو گی کہ ان کی دفعۃً رحلت کی خبر سن کر راشٹرپتی بھون کا مالی روتے روتے بے ہوش ہو گیا اور ان کے سکریٹریٹ کے ایک عہدہ دار پر قلب کا دورہ پڑا۔ کم لوگوں کو معلوم ہو گا کہ ذاکر صاحب ایک منصب سے دوسرے پر فائز ہوتے تو ان کے اسٹاف کے افراد دل سے خواستگار ہوتے کہ ذاکر صاحب ان کو اپنے عملے میں لے لیں۔ ان میں سے بعض دوڑ دھوپ کر کے اس میں کامیاب ہو جاتے۔ ذاکر صاحب اپنی مرضی یا مصلحت کی بنا پر کسی کا انتخاب کر لیتے تو یہ کوئی غیر معمولی بات نہ ہوتی اس لیے کہ بڑے بڑے عہدہ دار ایسا کیا کرتے ہیں اور ایک طور پر یہ حاکم کا حق سمجھا جاتا ہے۔ غیر معمولی بات یہ ہوتی کہ عملہ اس کا متمنی ہو کر ذاکر صاحب کی شفقت میں کام کرنے اور زندگی بسر کرنے کا موقع نصیب ہو۔

گذشتہ ۲۰۔۲۲ سال سے تادم واپسیں ذاکر صاحب کی خدمت بہر صورت و بہر حال جتنی میاں اسحٰق نے کی وہ کسی اور نے نہیں کی۔ خلوص کی، خاموش، شبانہ روز، غیر منقطع خدمت جو نہ اعزا و احباب کے بس کی تھی نہ دولت و اقتدار کی نہ کسی اور کے۔ یہ شغف و سپردگی ائمۂ دین کے مریدانِ باصفا یا خادمانِ خاص میں البتہ سنی اور دیکھی گئی ہے۔ شیخ الہند مولانا محمود الحسن مالٹا میں اسیر تھے تو سردی کے زمانے میں تہجد کی نماز ادا کرنے کے لیے مولانا حسین احمد مدنی لوٹے میں پانی بھر کر اپنی گود میں لے لیتے تھے جب گرم ہو جاتا تو مرشد کی خدمت میں پیش کر دیتے۔ اس واقعہ کی شیخ الہند کو شاید کبھی خبر نہیں ہوئی۔ کچھ اسی طرح کا حال میاں اسحٰق کا ذاکر صاحب کے ساتھ رہا۔ یہ سنہ ۱۹۴۸ء میں ذاکر صاحب کو من جملہ اسباب وائس چانسلری علی گڑھ میں دستیاب ہوئے۔ اس سے پہلے ڈاکٹر ضیاء الدین احمد کی خدمت میں تھے اور اپنے فرائض اس لگن سے بجا لاتے تھے کہ ذاکر صاحب نے ایک بار کہا تھا اسحٰق جس طرح ڈاکٹر ضیاء الدین کی خدمت کرتے ہیں صرف اسی کے صلے میں ان کی بخشائش مسلم۔ ان کو کسی اور عبادت کی یا کار خیر کی ضرورت نہیں ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے یہاں عموماً ہوتا کہ کم۔ کم نوٹس پر اور کبھی کبھی ایسا کرنا بھی بھول جاتے دعوت یا پارٹی دے ڈالتے اور مہمان چاہے جتنے خورد و نوش کا سامان کم سے کم ہوتا۔ اسی طرح وہ ہندوستان کے اندر یا باہر کے سفر پر جلد سے جلد بغیر

اہتمام کے بے سان گمان روانہ ہو جاتے ۔ اس زمانے میں مشہور تھا کہ ڈاکٹر صاحب سے زیادہ اور اچانک سفر کرنے والا اُن کے درجہ کا کوئی دوسرا نہ تھا ۔ یہ ذمہ داری میاں اسحٰق کی تھی کہ پارٹی بھی کامیاب رہے اور سفر میں بھی کوئی خلل نہ آئے ۔ اسحٰق نے کبھی ان تقریبوں کو حادثے میں تبدیل ہونے نہ دیا وہ جتنا کام کرتے اتنا ہی خاموش اور پرسکون رہتے ۔ دوسروں سے کام کم لیتے تھے خود زیادہ کرتے تھے ۔ ان کو کام کرتے ہوئے دیکھئے تو ایسا معلوم ہوتا جیسے کسی بڑے کارخانے میں کوئی بڑی مشین پورے طور پر برسر کار ہو اور کہیں سے بے آہنگ نہ ہو ۔ مشیت الٰہی کی کسے خبر، کیا عجب میاں اسحٰق کو خاص خدمت کی جو تربیت ڈاکٹر ضیاءالدین کے ہاں ملی ہو وہ بالآخر ذاکر صاحب کی آسائش صحت و سلامتی کے لیے تقدیر تھی ۔

علی گڑھ آتے ہی کچھ دنوں بعد ذاکر صاحب پر دل کا دورہ پڑا ۔ اس زمانے میں اپنے آرام یا تکلیف اور نفع نقصان سب سے منھ موڑ کر میاں اسحٰق نے ذاکر صاحب کو ہر زحمت سے بچانے اور ہر راحت کے پہنچانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا ۔ ہمہ وقت ذاکر صاحب کے سامنے یا آس پاس موجود ہوتے ۔ معالج کہتے کہ دوا علاج سے زیادہ میاں اسحٰق کی خدمت اور تیمارداری ذاکر صاحب کے لیے مفید و مبارک ثابت ہوئی ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ان کو وہم سا ہو گیا تھا کہ ذاکر صاحب کی دیکھ بھال کو کسی دوسرے پر چھوڑ دیا گیا تو ان کو نقصان پہنچ جائے گا جس کے لیے وہ (میاں اسحٰق) ذمہ دار ٹھہریں گے ۔ ذاکر صاحب کے بعض ملنے والوں نے اس پر آزردگی کا بھی اظہار کیا کہ ان کو دیکھنے یا ان سے ملنے کے لیے معالج کی نہیں بلکہ اسحٰق کی اجازت لینی پڑتی تھی ۔ دوا اور غذا منٹ منٹ کی پابندی سے دیتے ۔ ناشتہ اور کھانا اپنے ہاتھ سے تیار کرتے ۔ کمرے کی صفائی بستر کی درستی، گلدان میں پھولوں کا ردو بدل، ذاکر صاحب کو سہارا دے کر اٹھانا بٹھانا، غسل خانہ سے متعلق تمام امور کا انصرام کلیتہً اپنے ہاتھ میں رکھتے ۔ ذاکر صاحب کو نیند نہیں آتی تھی ۔ سونے کا وقت آتا تو تلوؤں پر مالش کرنے کے لیے تیل لے کر پہنچ جاتے اور جب تک اطمینان نہ ہو جاتا کہ نیند آ گئی ۔ اپنا شغل جاری رکھتے ۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ معمولی آہٹ پر نمودار نہ ہو جاتے ہوں ذاکر صاحب کو شکر آتی تھی ۔ میاں اسحٰق نے اس کو جانچنے کا طریقہ سیکھ لیا تھا ۔ ہر صبح قارورے کی رپورٹ، دواؤں کے نسخے، تشخیص کے تمام چارٹ پیش کر دیتے اور رات بھر کی کیفیت معالج کو سنا دیتے اور اس کی ہدایات کے مطابق دن کا پروگرام مرتب کرتے ۔ خود بیمار ہوں یا بیوی بچے، ان کے اپنے گھر کے جھگڑے جھمیلے ہوں یا کچھ اور میاں اسحٰق شاید ہی کبھی ذاکر صاحب سے

علیحدہ ہوتے ہوں۔ وہ اس طرح سے ذاکر صاحب سے وابستہ ہو گئے تھے کہ ان کو دیکھ کر معلوم ہو جاتا کہ ذاکر صاحب کس حال میں ہیں۔ بارے خدا نے شفا دی اور ذاکر صاحب یونیورسٹی کے کاموں میں اس طرح منہمک ہو گئے جیسے اس سے پہلے ایسے خطرناک مرض میں مبتلا نہیں ہوئے تھے۔

ذاکر صاحب کے زمانے میں وائس چانسلر کی کوٹھی جھونس کی تھی جو سر سید سے بھی پہلے عہد کی یاد دلاتی تھی۔ مئی جون میں علی گڑھ مسلسل پیلی آندھیوں کی زد میں ہوتا تو اس کوٹھی کے اندرون اور بیرون میں بہت کم فرق رہ جاتا۔ ایک رات ذاکر صاحب کے یہاں ڈنر تھا۔ کھانا ختم ہی ہوا تھا کہ ٹیلیفون آیا کہ کچھ اکابر دوسرے دن صبح سات بجے علی گڑھ پہنچیں گے اور بریک فاسٹ کھانے کے بعد آگے بڑھ جائیں گے۔ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ گرد و غبار کا شدید طوفان آیا اور دو گھنٹہ وہ سب ہوتا رہا جس کی زد میں کوئی شخص دیر تک نارمل نہیں رہ سکتا تھا۔ میاں اسحٰق کو بریک فاسٹ کی اطلاع دے دی گئی۔ انھوں نے اسی خاموشی، اطمینان اور غیر جانبداری کے انداز سے سنا جو ان کا شائل تھا۔ تھوڑی دیر بعد سائیکل اور جھولا سنبھالا اور شہر کو روانہ ہو گئے۔ رات گئے معلوم نہیں کب تک کہاں کہاں کی خاک چھانی اور کن دوکانداروں سے رابطہ قائم کیا اور ضروری اشیاء لے کر واپس آ گئے۔ جو چیزیں باورچی خانے میں تیار کرنی تھیں وہ کیں۔ تمام رات کمرے جھاڑتے صاف کرتے رہے سب کچھ بذات خود اور بدست خود۔ صبح دیکھا گیا تو ایسا معلوم ہوا جیسے رات کو طوفان نہیں باد صبا آئی تھی اور اپنے ہمراہ صفائی، ستھرائی، خوشگوار فضا اور بریک فاسٹ ساتھ لائی تھی۔ سارا سماں دیکھ کر ایک صاحب نے فرمایا۔ ذاکر صاحب، معلوم ہوتا ہے رات آپ کی کوٹھی طوفان کی زد میں نہیں آئی۔ ذاکر صاحب نے فرمایا۔ کوٹھی تو زد میں آئی لیکن طوفان کی بد نصیبی کہ وہ خود اسحٰق کی زد میں آ گیا!

دہلی میں ذاکر صاحب سے کبھی ملنا ہوتا تو یہ کسی طرف سے نمودار ہو جاتے۔ ذاکر صاحب کے کہے بغیر لیکن ان کی خواہش اور خوشی کے عین مطابق، فواکہات لا کر سامنے رکھ دیتے اسی ادب اور آداب سے، جس میں مزید آمیزش خلوص و محبت کی ہوتی، جو بڑے سے بڑے سرکاری اور غیر سرکاری مہمان کی مدارات کے پیش نظر ملحوظ رکھے جاتے ہیں۔ اس پر خوش کہ ذاکر صاحب سے ملنے آیا اور ذاکر صاحب کو ان کی حفاظت و امانت میں پایا۔ میرے لیے اچھی سے اچھی کھانے پینے کی چیزیں ایک ٹوکری میں پیک کر کے ساتھ کر دیتے اس فخر سے جیسے ذاکر صاحب کو میرے ساتھ ایسا ہی سلوک کرنا چاہیے تھا۔ تحفہ پانے کی مجھے کیسی خوشی ہوگی اور سب سے بڑی بات یہ کہ

ذاکر صاحب نے یہ سلوک مجھ سے ان کی معرفت کرایا۔

ذاکر صاحب نے علی گڑھ سے باہر ملک اور حکومت کی دوسری اہم ترین ذمہ داریاں سنبھالیں۔ کتنے دور دراز کے ملکوں کا آئے دن سفر کرتے رہنا، کتنے نئے مسائل اور ان کے نازک و مشکل تقاضوں سے دوچار ہوتے رہتے ہوں گے۔ جن کا اثر ان کی کمزور صحت پر پڑتا ہوگا۔ ان کی غیر معمولی، اخلاقی، علمی، ذہنی اور دوسرے اعلیٰ صلاحیتوں کی عالمگیر شہرت نے ان پر طرح طرح کی ذمہ داریاں عائد کر رکھی تھیں۔ وہ محض صاحب منصب نہ تھے۔ جس کے چھوٹے بڑے بندھے ٹکے فرائض سکریٹریٹ کے کمپیوٹرس کرتے رہتے ہیں اور روزانہ کے کاموں کی خانہ پری ہوتی رہتی ہے۔ میاں اسحٰق ذاکر صاحب کے اس تمام سفر و سیاحت میں سایہ کی طرح ساتھ ہوتے۔ اور ان کی راحت اور کلفت کو اس طرح بلٹتے رہنے کی فکر میں رہتے کہ ذاکر صاحب کے حصے میں صرف راحت آئے اور ان کی ساری کلفتیں یہ جھیلتے رہیں۔ ذاکر صاحب سفر میں ہوتے تو متعلقین اور مخلصین کو اس کا یقین اور اطمینان رہتا کہ صدر مملکت کے شایان شان شروع سے آخر تک ہر منزل اور موقع پر حفاظت، منزلت اور راحت کے تمام ممکنہ انتظامات میزبان حکومتوں کی طرف سے مکمل ہوں گے۔ لیکن میاں اسحٰق کے ساتھ ہونے سے گھر والوں کو اس کی بھی تقویت رہتی اور یہ کوئی معمولی تقویت نہ تھی کہ ذاکر صاحب کی خدمت اور رفاقت کے لیے ان کا اور سارے گھر کا معتمد خاص بھی ساتھ ہے جو کسی رشتہ دار سے کم نہ تھا، بعض اعتبار سے زیادہ ہو تو عجب نہیں۔

مصالح مملکت کے پیش نظر، پہلے زمانے کے سلاطین وصنادید کی علالت، کبھی کبھی رحلت تک کی خبر حتی الوسع راز میں رکھی جاتی تھی۔ آج کل کے ڈکٹیٹرس کی بھی۔ شاید اسی روایت کا لحاظ رکھتے ہوئے میاں اسحٰق نے کبھی نہیں بتایا کہ ذاکر صاحب کی طبیعت خراب ہے۔ ناساز بھی ہوتی تو یہی بتاتے کہ اللہ کا فضل ہے۔ ذاکر صاحب کے متعلقین، راشٹرپتی بھون کے عمال، وہاں کی تقریبوں کی تفصیل ملاقاتیوں کی آمد و رفت، صدر مملکت کے ایوان کے کسی چھوٹے بڑے واقعہ کا ذکر شاید ہی کبھی کرتے ہوں۔ کسی نزاکت کا سامنا ہوتا تو "بجز خلید دا ہیچ نہ گفت" پر عمل کرتے۔ ان کی عام خاموشی، ایک طرح کا مستقل رکھ رکھاؤ اور اپنے کاموں میں مسلسل مشغولیت ان کو زبان اور کان کے ہر طرح کے فتنے سے محفوظ رکھتی۔ آج تک وہ کسی اسکینڈل کے راوی ہوئے نہ ریویور۔ ان میں یہ اتنی بڑی فضیلت ہے کہ کتنے فضیلت مآب ان سے آنکھ نہیں ملا سکتے۔

آخر وہ دن اور وقت آگیا جو سب کو پیش آنے والا ہے سوا اس کے جس کے لیے زمان ہے نہ

مکان ، نصرت ، اختیار ، سب و اقتدار ۔ جہاں آخر رب کو اپنی امانت واپس لینے کا ذاکر صاحب کو دفعتہً پیغام آیا ۔ اس وقت بھی میاں اسحٰق غسل خانے سے لگے باہر کھڑے تھے ۔ ان کو اس کا احساس تھا کہ معلوم نہیں کب اور کہاں ذاکر صاحب کو ان کی ضرورت پڑے ۔ اس لیے جہاں تک ممکن ہوتا وہ محافظ فرشتہ کی مانند ذاکر صاحب کے آس پاس ہی رہتے ۔ چنانچہ سب سے پہلے روح سے جدا جسد جسم کو اسحٰق ہی نے دیکھا ، چھوا اور بے قراری و محرومی کے بے اماں احساس کے ساتھ دعائے مغفرت کی چادر میں لپیٹ لیا ۔ جب تک میت گھر پر رہی اور تیسرے دن جب سپردِ خاک کی گئی ، حاضر غائب لحظہ بلحظہ دیکھ بھال کرتے اور اس پر نثار ہوتے رہے جیسے ابھی ابھی ان کے تلووں پر تیل کی مالش کر کے اٹھے ہوں اور ذاکر صاحب کی آنکھ لگ گئی ہو ۔ راشٹرپتی بھون سے قبر کے کنارے تک پھولوں سے ڈھکے ہوئے جسم اور کھلے ہوئے چہرہ پر مسلسل کئی گھنٹے کھڑے کھڑے پنکھا جھلتے اور مٹی کی گرد اور گرمی سے بچاتے ہوئے پہنچے ۔ یہاں تک کہ ذاکر صاحب کو ہر طبقہ کے بے شمار ماتم گساروں کے یاس والم اور دعائے مغفرت کے ہجوم میں سپردِ خاک کر دیا گیا ۔ میاں اسحٰق کے اعصاب نے تین دن تک اس مسلسل فشار کو بالخصوص راشٹرپتی بھون سے جامعہ ملیہ تک جہاں تدفین عمل میں آئی کس طرح برداشت کیا ، کتنا عجیب کرشمہ ہے ۔ کون جانے احساسات کے تانے بانے پر بُنے ہوئے انسان میں یہ توانائی کہاں سے آئی !

جب سے اسحٰق ذاکر صاحب سے وابستہ ہوئے میں نے ان سے زیادہ کسی اور کو ذاکر صاحب کے ساتھ اور ان کے قریب نہیں پایا ۔ چنانچہ ذاکر صاحب کے نزدیک ترین عزیزوں اور دوستوں سے ملنے کا اتفاق ہوتا ہے تو اتنا خیال ذاکر صاحب کی طرف نہیں جاتا جتنا اسحٰق کو دیکھتے ہی ذاکر صاحب یاد آجاتے ہیں اور ایک بار پھر پچھلی یادیں دور تک جگمگاتی چلی جاتی ہیں جیسے ماضی کے ستونوں کی طویل قطار پر بجلی کے قمقمے سرِشام یکے بعد دیگرے چشم زدن سے بھی کم وقفوں کے ساتھ روشن ہوتے ہوئے ماضی کی تاریک اور پر اسرار خاموشیوں میں غروب ہو جاتے ہوں ۔ خدمت اور خلوص کا یہ فیضان تمام دوسرے رشتوں سے کتنا عجیب ، کتنا مختلف اور کتنا گراں بہا ہوتا ہے اس کا اندازہ وہ لوگ کیسے کر سکتے ہیں جن کا قد و قامت خود ان کے بالشت سے بھی کم ہوتا ہے !

اسحٰق نے ذاکر صاحب کی خدمت گذاری میں ماں بہن بھائی اولاد سب کی شفقت ، محبت ، حمیت اور جاں نثاری کا حق ادا کر دیا ۔ آج وہ اُس احساس محرومی و مفارقت میں بھی برابر کے شریک ہیں جن سے اراکین خاندان دوچار ہیں ۔ شب و روز کی اپنی مسلسل خاموش خیر خواہی اور احساس ذمہ داری سے ۔ کون کہتا ہے دنیا سے رسم وفاداری اٹھ گئی ۔

ذاکر صاحب کی تصانیف، تراجم اور لکچرز پر ارباب فکر و فن نے شرح و بسط سے اظہار خیال کیا ہے ان گرانقدر خیالات پر میں کوئی اضافہ نہیں کر سکتا۔ یہاں اس کی ضرورت بھی نہیں معلوم ہوتی۔ ذاکر صاحب سے اکثر فرمائش کرتا کہ اپنی زندگی اور ہم عصروں اور ہم سفروں کے بارے میں کچھ لکھ ڈالیں۔ یہ بھی عرض کرتا کہ یہ اس لیے نہیں کہہ رہا ہوں کہ اس سے آپ کی شہرت میں اضافہ ہوگا البتہ اس کا یقین ہے کہ اردو میں جو چیز آپ لکھ دیں گے وہ اس صنف ادب میں بے نظیر ہوگی اور علی گڑھ کی طرح میں اردو کو بھی بے نظیر ہی دیکھنا چاہتا ہوں۔ بات کچھ آگے چلی تو عرض کیا کہ اردو جس حال کو پہنچ گئی یا پہنچا دی گئی ہے اس کے باوجود میرا خیال ہے کہ جو چیز اردو میں بے نظیر ہوگی وہ دنیا کے کسی اچھے شعر و ادب میں کم بے نظیر نہ ہوگی۔ میری اس طرح کی گرم گفتاری یا بے اختیاری پر ذاکر صاحب بالعموم مسکرا دیتے یہ مسکرانا اس طرح کا ہوتا جیسے میرا کہنا بھی درست تھا اور اس کا نہ ماننا جانا بھی نادرست نہ تھا۔ یہ فرمائش پوری نہیں ہوئی۔ ذاکر صاحب چاہتے بھی تو شاید نہ کر سکتے۔ جس منصب عالیہ پر وہ فائز تھے اور جن پر وہ رہ چکے تھے اور طرح طرح کی جن ذمہ داریوں کا سامنا تھا اس میں کوئی ایسا بیان دینا جس سے کسی فتنے کے اٹھ کھڑے ہونے کا امکان ہو قرین مصلحت نہ تھا۔ وہ اپنے بے شمار ملنے والوں اور رفقا میں سب کو قابل اعتبار و احترام نہیں سمجھتے تھے۔ شاید کوئی بھی نہیں سمجھتا۔ سرگزشت لکھنے میں اس طرح کی نزاکتیں قدم قدم پر پیش آتی ہیں۔ چنانچہ ذاکر صاحب نے وہی کیا جو ہمیشہ سے کرتے آئے تھے یعنی جھگڑنے سے جھیلنے کو بہتر سمجھا۔ یوں بھی جب ہر طرف بارود بکھری ہو اس وقت شرر یا شرر پر دونوں سے دور رہنا اور دوسروں کو رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ہر شخص بقدر استعداد و ظرف قدرتی طور پر اس کا خواہشمند بھی ہوتا ہے کہ وہ زندگی کے نشیب و فراز یا سرد و گرم سے جس طور گذرا ہے اس کا اظہار کسی نہ کسی شکل میں کسی نہ کسی وسیلے سے کرے اور اس کے تاثرات و تجربات میں اس کا کوئی شریک ہو اور ان کی تصدیق کرے۔ جو لوگ خلوص و خدمت کی زندگی بسر کرتے ہیں وہ ایک طور پر مامور من اللہ ہوتے ہیں۔ ان کی پیروی و تصدیق خیر و برکت کی محرک و موجب ہوتی ہے۔ ذاکر صاحب کی پوری زندگی ایسی ہی تھی۔ ان کی سرگزشت اچھے اور برے لوگوں کے اچھے اور برے کاموں میں ہمیشہ تصنیف ہوتی رہے گی!

ذاکر صاحب نے اپنی سرگزشت نہیں لکھی لیکن جس کام کے لیے وہ شعوری طور پر آمادہ نہیں ہوئے ان کے اعلیٰ فکر و عمل کے تقاضوں نے ان سے غیر شعوری طور پر کرا لیا۔ انھوں نے ایک قصہ لکھ ڈالا۔ کچھ دن ہوئے اس کا مسودہ میں نے پڑھا تھا تفصیل یاد نہیں رہی۔ لیکن اس کے تاثرات ذہن کے

پردوں پر طرح طرح کے نقش و نغمے میں ابھرتے رہتے ہیں۔ قصہ کچھوے اور خرگوش کی دوڑ اور فتح و شکست کا ہے جس کو معلوم نہیں کب سے ہم اپنے اب و جد سے سنتے چلے آرہے ہیں اور آنے والی نسلیں رہتی دنیا تک سنتی اور سناتی رہتی رہیں گی۔ اس فرق کے ساتھ کہ وہ قصہ بچوں کے لیے تھا۔ ذاکر صاحب نے اس کا رخ بچوں کے بزرگوں کی طرف پھیر دیا ہے۔ پرانی شراب کو نئی بوتلوں میں نہیں پیش کیا ہے جیسا کہ ایسے موقع پر کہہ کر فارغ ہو جایا کرتے ہیں، بلکہ پرانی شراب کو نیا نشہ اور نئے میکش و مے خانے دیے دوسرے الفاظ میں یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ نئی نسل کو نئی نگاہ بخشی گئی ہے۔ ذاکر صاحب نے اس قصے کا جو قصہ لکھا ہے اسے پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ جس تصنیف کا تعارف کراتے ہیں اس سے اس کی کتنی دنعت بڑھ جاتی ہے۔ اکثر یہ طے کرنا دشوار ہو جاتا ہے کہ ذاکر صاحب کا یہ احسان کس پر زیادہ ہے مصنف یا اس کے پڑھنے والے پر۔ جمہوریہ فلاطون کا انھوں نے جو اردو ترجمہ کیا ہے اس کے مقدمے کو پڑھ کر یہی احساس ہوتا ہے۔ زیر نظر تصنیف کو تمثیل، افسانہ، کہانی جو چاہے کہہ لیجیے۔ بہتر اور صحیح تر یہ کہنا ہوگا کہ یہ "آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری" کی مصداق ہے۔ بڑا فن کار در اصل وہ ہے جس کے فن پارے میں ہر فن کے حاصل اور حسن کی جلوہ گری ملے۔ اسی کو فن کار اعظم اور اس کی قدرت کے قریب ہونا کہتے ہیں جو ہر فن کار کا منتہائے نظر اور مقصد اعظم ہوتا ہے!

قصے کا مکان و مقام نواح جامعہ ملیہ ہے۔ اس سے متصل دور تک پھیلی ہوئی جمنا کی آب رواں کی صاف و شفاف چادر اور ریت کا لہریے دار رقبہ ہے جگہ بڑی سکوت افزا، خوبصورت اور صحت بخش ہے۔ یہاں جامعہ کے اساتذہ اور طلبا صبح شام سیر کرنے جایا کرتے ہیں۔ دلی سے بھی لوگ فرصت منانے اور خوش وقت ہونے کے لیے آیا کرتے ہیں۔ ایک دن جامعہ کے ایک مولوی صاحب کی ملاقات ایک سال خوردہ کچھوے سے ہو گئی جو ریتی پر ایک طرف کسی گہری سوچ اور حیرانی میں بیٹھا ہوا تھا۔ مولوی صاحب سے صاحب سلامت ہوتی ہے۔ مولوی صاحب کی تپاک و توجہ سے ہمت افزائی ہوئی تو کچھوا ڈرتے ڈرتے پوچھتا ہے، مولوی صاحب بہت دنوں سے ایک کُرید پیدا ہو گئی ہے جس سے نہ دن کو چین ہے نہ رات کو۔ آپ بڑے ودوان ہیں کوئی اپائے بتائیے۔ مولوی صاحب ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں تو بڑے تردد سے پوچھتا ہے، مولوی صاحب پرکھوں سے سنتا آ رہا ہوں کبھی کچھوے اور خرگوش کی دوڑ ہوئی تھی۔ کوئی کچھ کہتا ہے کوئی کچھ۔ آپ بتائیے جیت کس کی ہوئی تھی۔ مولوی صاحب سوچ میں پڑ جاتے ہیں۔ ایک طرف کچھوے کی مدد کرنا چاہتے ہیں دوسری طرف اس کے سوال کا جواب اپنے بس کا نہیں پاتے۔ لیکن ایک سادہ دل اور بہادر انسان کی مانند مشکلات

کو خاطر میں لائے بغیر انھوں نے کچھوے کے دردِ سر کو اپنا دردِ سر بنا لیا۔ پھر جیسے مایوسی کے گھور اندھیرے میں کوئی جگنو چمک گیا ہو بڑے اعتماد اور افتخار کے لہجے میں بولے، اطمینان رکھو ہمارے یہاں ایک سے ایک ودوان رہتے ہیں۔ کل صبح سویرے یہاں لاؤں گا وہ تمھارا اطمینان کرا دیں گے۔ کچھوا مطمئن ہو گیا۔ دوسرے دن صبح کو مولوی صاحب نے اپنے یہاں کے عالموں میں سے ایک کو ساتھ لے چلنے پر آمادہ کیا۔ کچھوا اپنی جگہ پر مجسم انتظار و انکسار بیٹھا ہوا ملا۔ مولوی صاحب نے تعارف کرایا۔ کچھوے نے ہاتھ جوڑ کر بڑے ادب اور عاجزی سے اپنا سوال پیش کیا۔ عالم نے کچھوے کے سوال اور اس کی پریشانی کو نظر انداز کر کے اپنے علم کے سمندر اور اپنی شناوری پر خطبۂ صدارت شروع کر دیا۔ کچھوے کی سمجھ میں کچھ نہ آتا۔ موقع پا کر بڑی لجاجت سے اپنا سوال دہراتا تو عالم چراغ پا کر طوفانِ تکلم کو مہمیز کر دیتا۔ کچھ دیر بعد عالم چلے گئے۔ کچھوے نے بڑے دکھ اور مایوسی سے مولوی صاحب سے پوچھا مولوی صاحب کیا یہ ودوان مجھ سے یا میری باتوں سے ناراض ہو گئے۔ مولوی صاحب کو بڑی ندامت اور اتنا ہی غم ہوتا ہے لیکن کچھوے کو دلاسا دیتے ہوئے کہتے ہیں، مایوس نہ ہو کل دوسرے ودوان کو لاؤں گا۔ وہ تمھاری مشکل آسان کر دیں گے صبح کو یہیں ملنا۔ دوسرے دن مولوی صاحب دوسرے علم کے ایک عالم کو لے جاتے ہیں۔ کچھوا بدستور اپنی جگہ پر امید لگائے بیٹھا ہوا ملا۔ آج بھی وہی حادثہ پیش آتا ہے جو کل آیا تھا۔ کچھوے کی مایوسی بڑھتی جاتی ہے لیکن مولوی صاحب کی امید اور عزم بڑھتا جاتا ہے۔ وہ ہر شام کچھوے کو دلاسا دیتے ہیں اور وعدہ کرتے ہیں کہ دوسری صبح کو نئی شان و شہرت کا ودوان لائیں گے۔ صبح ہوتی ہے نئے ودوان آتے ہیں۔ مولوی صاحب بڑی امید اور ارمانوں کے ساتھ ان کے ہمراہ ہوتے ہیں لیکن کچھوے کی شام کی صبح نہیں ہوتی۔ یہاں تک کہ ایک ایک کر کے سارے ودوان اور ان کے داکھیاں ختم ہو جاتے ہیں یہاں سے اب یاد نہیں رہا ہے[1] کہ کیا ہوا جس کے بعد کچھوے اور خرگوش کی دوڑ ہوئی۔ کچھوا پیچھے

فٹ نوٹ:-

[1] ذاکر صاحب کی وفات کے بعد کئی بار کوشش کی کہ اس تصنیف کا مسودہ تھوڑی دیر کے لیے سرسری طور پر دیکھنے کو مل جائے تاکہ جو باتیں بادرہ گئی ہیں یا یاد آتی رہتی ہیں ان کی صحت یا عدم صحت کی طرف سے اطمینان ہو جائے اور جو یاد نہیں ہیں وہ یاد آ جائیں لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ اس وجہ سے اگر ان سطور میں کہیں کوئی غلط بیانی یا اخذ نتائج میں کوئی نقص راہ پا گیا ہو تو معاف فرمایا جائے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ بعد میں وقتاً فوقتاً ذاکر صاحب نے کہیں کہیں حذف یا مختصر حذف، اضافے یا ترمیم سے کام لیا ہو جس کی مجھے خبر نہ ہو۔ اس ڈرامے کا ذکر اس لیے کرنا پڑا کہ اس میں اس سرگزشت کی (جو نہیں لکھی گئی) بہت سی باتیں سرِ دلبراں اور حدیثِ دیگراں کے راستے سے آ گئی ہیں۔ سرگزشت سے ذاکر صاحب کے حصائل پر روشنی پڑتی۔ اس تصنیف سے ان کے فضائل کا روشنی کا منارہ سامنے آتا ہے۔

رہ گیا، در خرگوش چھلانگیں مارتا اچھلا کودتا بھرتا مقررہ نشان پر پہنچ گیا جو ایک زمیندار کا سرسبز شاداب لہلہاتا ہوا باغ اور کھیت تھا۔ یہاں پہنچ کر کبھی گھاس کترتا کبھی ترکاری کی کیاری میں تھرکتا اور طرح طرح سے اظہار خرمی کرتا۔ دفعتہً ایک طرف سے زمیندار کا لڑکا اپنے شکاری کتے کے ساتھ نمودار ہوا۔ کتے نے جھپٹ کر خرگوش کا گلا دانتوں میں لے کر جھٹکا دیا اور خرگوش بے جان ہو کر کتے کے منہ میں لٹک کر رہ گیا یہ منظر دیکھ کر کچھوا کرب سے بلبلا اٹھا اور بولا "ارے یہ کیا ہوا، یہ تو میں نے نہیں چاہا تھا" ڈراما ختم ہو گیا!

اس کا اطمینان نہیں ہے کہ ذاکر صاحب نے ڈرامے کے تمام مناسبات اور جزئیات کا لحاظ رکھتے ہوئے جو باتیں جس طرح پیش کی ہیں اور سطر سطر میں ان کی بے مثل قدرت تحریر، طنز و طباعی اور حقائق کے عرفان و احترام کی جو مثالیں ملتی ہیں اس کا خاطر خواہ تعارف کرا سکا ہوں۔ میرے لیے یہ آسان بھی نہ تھا اس لیے کہ مجھے ڈرامے کی تاریخ سے واقفیت ہے نہ اس کے تکنیک اور نزاکتوں کا علم۔ لیکن اس ڈرامے کے مطالعہ سے اس کا احساس ضرور ہوا کہ یہ فن کتنا اہم کتنا مشکل اور ممکنات سے کس درجہ لبریز ہے! نیز یہ کہ اردو میں ڈرامے کے اچھے نمونے کتنے کم ہیں۔ بتایا جاتا ہے کہ طربیہ ہو یا المیہ، ڈرامے کا کرائسس بتدریج بڑھتا رہتا ہے۔ اسی اعتبار سے انجام کی خبر اور خطوط واضح ہونے لگتے ہیں۔ ذاکر صاحب کے اس ڈرامے کا امتیاز جو بہت کم ڈراموں میں نظر آئے گا یہ ہے کہ آخر کی دو تین سطروں سے پہلے تک کوئی نہیں کہہ سکتا کہ بظاہر ایسا ہلکا پھلکا طربیہ ایسے گہرے اور ہوش چکرا دینے والے المیہ پر ختم ہو گا۔

جس طرح اس ڈرامے کی جان کچھوے کا یہ فقرہ ہے "ارے یہ کیا ہوا، یہ تو میں نے نہیں چاہا تھا" اسی طرح ڈرامے کا آخر پڑھ کر پڑھنے والا بے اختیار کہہ اٹھے گا "ارے یہ کیا ہوا یہ تو میرے حاشیہ خیال میں بھی نہ تھا" ذاکر صاحب کی اس تصنیف نے اردو ڈرامے کو اول اور آخر ایک ہی کوشش میں اردو غزل کے معیار تک پہنچا دیا۔ کیا کروں میری طبیعت فن اور فن کار کو اکثر اردو غزل کی میزان میں تولنے پر مائل رہتی ہے!

سچائی بہت سہل اور سادہ ہوتی ہے۔ ایسی نہ ہوتی تو ہر شخص کو بتایا کیسے جا سکتا اور وہ سمجھ کیوں کر پاتا کہ سچائی کتنی ضروری ہے اور اس پر عمل کرنا چاہیے لیکن اس کی تلاش و تصدیق اتنی ہی مشکل ہے۔ متلاشیان کی تقدیر اسی کی شہادت دیتی ہے۔ ڈرامے کا مرکزی اور بنیادی کردار کچھوے کا ہے۔ کتنا مختصر سیدھا سادا کیرکٹر۔ ان صفات اور اتنی ہی سی صفات کا ہیرو شاید ہی کسی اور ڈرامے میں نظر آئے۔ وہ اس حقیقت کی تلاش میں ہے کہ مقابلہ کیا ہے، ہار جیت ...

کہتے ہیں، ایسا کیوں ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ کیا ہونا چاہیے۔ تجسس اور تفتیش کی اس مہم کا آغاز وہ بڑی مسکنت اور انکسار سے کرتا ہے۔ اس کا بڑا خیال رکھتا ہے کہ اس سے کسی کو تکلیف نہ پہنچے، کوئی آزردہ نہ ہو۔ اس کا گمان بھی ہوتا ہے تو وہ تلاش حق کو نظر انداز کر کے تالیف قلب پر مائل ہو جاتا ہے اور طرح طرح سے معذرت کرتا ہے۔ خرگوش کا المناک حشر دیکھ کر اس پر جو کرب طاری ہوتا ہے اور جو کلمات بے اختیار اس کے دل کی گہرائیوں سے نکلتے ہیں ان میں کیا اشارے ملتے ہیں، ان مسائل پر بحث کرنے کا حق جن ارباب فکر و نظر کو پہنچتا ہے ان میں میں نہیں ہوں۔ البتہ اس آواز کی گونج سے کان آشنا معلوم ہوتے ہیں، جیسا کہ فانی نے کہا ہے۔

آواز آ رہی ہے یہ کب کی سُنی ہوئی!

فانی شاعر تھے وہ غیب کی آواز سُن سکتے تھے اور اس کی تعبیر بھی جرأت سے کر سکتے تھے۔ مجھ عامی کو تو ایسا محسوس ہوا کہ یہ اسی انداز و انتباہ کی آواز تھی جو آج سے ۲۲ سال پہلے دہلی میں شقاوت کی ایک شام کو سنائی دی تھی۔ کیا عجب زیر نظر ڈرامے کے ہیرو کی صدائے کرب اسی آواز کی بازگشت ہو جس کی ذاکر صاحب نے اس محبت و حسرت سے یاد دلائی ہو۔

ڈرامے میں ہجوم تو بہتوں کا ہے بالخصوص ودوانوں کا لیکن ممتاز صرف دو ہیں۔ کچھوا اور مولوی صاحب۔ مولوی صاحب کا علم اور عقل دونوں واجبی ہیں۔ جو مسائل ڈرامے میں آئے ہیں ان کا سمجھنا موصوف کے بس کی بات نہیں۔ لیکن کسی کی تکلیف و تردد میں کام آنے کے لیے اپنی ساری اچھی صلاحیتیں اور ذرائع و وسائل کو بے دریغ کام میں لانے اور مسلسل ناکامی کے باوجود کوشش جاری رکھنے بلکہ تیز تر کر دینے اور رکھنے کا جیسا ناقابل تسخیر جذبہ ان میں ملتا ہے وہ لاجواب و لازوال ہے۔ پہلی ہی ملاقات میں ان کو کچھوے کا مکمل اعتماد حاصل ہو جاتا ہے۔ کچھوے کی ذہنی خلش ان کی سمجھ میں نہیں آتی لیکن اس کو دور یا کم کرنے کے لیے ان کی تمام تعمیری و اخلاقی صلاحیتیں بیدار ہو جاتی ہیں۔ جامعہ میں چوٹی کے جتنے ودوان تھے ان سب کو یکے بعد دیگرے کچھوے کے پاس لے جاتے ہیں کہ وہ اپنے علم کے زور سے کچھوے کی مشکل آسان کر دیں۔ لیکن ان علما کا بندھا ٹکا، فرسودہ، بے آب و گیاہ و بے برگ و ثمر، غیر منہضم و غیر مربوط علم جو شخصیت کے فیضان سے دور اور محروم رہا ہو، انسانی مسائل کی نہ کبھی تشخیص کر سکا نہ اس کا حل پیش کر سکا۔ صورت حال یہ ہے کہ کچھوے کی تشفی ہوتی ہے نہ مولوی صاحب ہار مانتے ہیں۔ کتنے محدود، ناقابل اعتبار و ناقابل لحاظ مادی اور ذہنی وسائل کے ایک فرد کو رفیق اعلیٰ کی طرف سے کتنی ارجمند رفاقت و ہمدمی کی دولت نصیب ہے!

بیچارے کھوے اور بیچارہ تزمولوی دونوں کے سامنے وتوانوں نے اپنی اپنی فہم و فراست کا جیسا مولویانہ مظاہرہ کیا اس سے پتہ چلتا ہے کہ آج کل ہمارے علم و عقل اور عقیدہ کا معیار یا سطح کیا ہے اور عالموں میں عطائیت یا سطحیت کہاں تک سرایت کر چکی ہے۔ مغربی شعر و ادب کا میں معترف ہی نہیں اس سے مرعوب بھی ہوں لیکن اپنے اچھے سے اچھے تنقید نگاروں کو مغربی ادب کے نام سے یا اس کی آڑ لے کر جو کچھ پیش کرتے دیکھتا ہوں اور جس طرح ان کے پس رو اپنے شعر و ادب کی عبادت گاہوں پر پتھر پھینکتے ہیں اور طرح طرح کا فتنہ اٹھ کھڑا ہوتا ہے، اس سے تفریح بھی ہوتی ہے، عبرت بھی! دوسرے اور تیسرے درجے کے تنقید نگاروں سے قطع نظر جو لوگ ہمارے یہاں کے سربرآوردہ تنقید نگار مانے جاتے ہیں، ان کی تحریروں کو بھی دیکھ کر کچھ کم حیرت نہیں ہوتی۔ جب غالب کے زمانے میں پابندی رسم و رہ عام اتنی بڑھ گئی تھی کہ غالب کو اہل خرد کو متنبہ کرنا پڑا تھا کہ وہ کس روش خاص پہ نازاں ہیں تو آج ان کی صد سالہ برسی کے عہد میں شعر و ادب کا جو معیار رہ گیا ہے اس کا اندازہ کرنا مشکل نہیں ہے۔ کبھی کہیں پڑھا یا سنا تھا کہ ایک من علم کو سمجھنے کے لیے دس من عقل چاہیے۔ اسی طرح کا کوئی فارمولا ہمارے ایسے تنقید نگاروں کے لیے وضع ہونا چاہیے جن کے یہاں دونوں من مانی ہیں! آج کل کے علم و علما کا جو نقشہ اس ڈرامے میں ذاکر صاحب نے کھینچا ہے وہ بڑا دلنشیں اور فکر انگیز ہے۔ اس کا اندازہ اس وقت ہو سکتا ہے جب ہم اس امر کو ملحوظ رکھیں کہ خود ذاکر صاحب کو ان علوم پہ کتنا کامل عبور تھا کہ انھوں نے اس خوبصورتی اور مہارت فن سے ان کے عالموں کے مبلغ علم کی نشان دہی کی ہے۔ کسی علم، فن یا فن پارے کی تعریف کرنا آسان ہے اور قابل معافی بھی۔ لیکن اس کے نقد و جرح کے لیے اس فن کار سے کافی زیادہ استعداد نہ ہو تو لب کشائی جرم ہے۔ اتنا بڑا جرم جس کو حماقت کہتے ہیں!

جس طرح فضا میں خلا محال ہے اسی طرح اردو ڈرامے (افسانوں میں بھی) عورت اور VILLAIN (ڈرامے کا بدکردار یا بدخصال) کی عدم موجودگی بھی محال ہے۔ کیسا فن، کیسے فتنے! جیسے عورت اور ولین قصے کے دو پہیے یا پاور کا کام دیتے ہوں۔ زیر نظر ڈرامے میں دونوں میں سے ایک بھی نہیں ہے۔ صرف کچھوا اور مولوی صاحب سب کچھ ہیں لیکن انسانی فضائل کے کیسے کیسے گرانقدر مسائل و مثالیں ان دونوں کے گرد ابھرتے اور حل ہوتے ہیں! عورت اور ولین کی کشش نہ ہونے کے باوجود یہ ڈراما طرح طرح کے ڈرامائی لمحات اور احوال سے لبریز ہے۔ ڈرامے میں شروع سے آخر تک ذاکر صاحب کی پہلو دار شخصیت کی بڑی دلکش جلوہ گری ملتی ہے۔ خفی اور جلی دونوں! اچھے ناول، افسانہ اور ڈرامے میں ہیرو در اصل مصنف خود ہوتا ہے۔ ضابطے کے ہیرو کی حیثیت وجود ظلی کی ہوتی ہے۔ یا سودہ پڑھنے

کے بعد ذاکر صاحب سے عرض کیا تھا کہ اگر اس کا عمدہ ترجمہ ملک کی ممتاز زبانوں اور انگریزی میں شائع ہو سکے تو بڑا مفید کام ہوگا۔ اپنوں کے علاوہ غیر ممالک کے دانشور بھی اندازہ کر سکیں گے کہ یہ ڈراما ضمیر انسانی کا کتنا سچا اور اچھا ترجمان ہے۔ یہ ایک ایسی تصنیف ہے جو ملک کے ہر اعتبار سے کسی معتبر سفیر کی ہو سکتی ہے۔ اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ آج تک اچھے سفیر کی ہر ملک کو کتنی ضرورت ہے۔ ذاکر صاحب نے اس کے جواب میں وہی کیا اور کہا جو ایسے موقعوں پر وہ بالعموم کہا یا کیا کرتے تھے جس کی طرف پچھلے سطور میں کہیں اشارہ کر چکا ہوں۔

زندگی کی خوشی اس میں نہیں ہے کہ ہر خواہش پہ دم نکلے۔ خوشی اس میں ہے کہ ہم کتنوں کے رنج و راحت میں اور کتنے ہمارے رنج و راحت میں شریک رہے۔ اسی کو عزت و محبت کی زندگی کہتے ہیں جو صرف انسان کو نصیب ہے۔ زندگی منزل بہ منزل اسی راستے اور روشنی میں ترقی و تہذیب کی اس بلندی تک پہنچی ہے جس سے آج ہم سرفراز بھی ہیں، سرگراں بھی! زندگی کا یہ کارواں کیسی کیسی آزمائشوں سے گذرتا ہوا ہم تک پہنچا ہے اس کا اندازہ ان اچھے اور بڑے لوگوں کی دلسوزی، دانش مندی اور دلیری کی خدمات سے کیا جا سکتا ہے جنھوں نے ہر خطرہ کا سامنا کیا اور ہر طرح کے مصائب جھیلے لیکن زندگی کے صحیح اور سیدھے راستے سے منھ نہ موڑا۔ اسی سے یہ امید توی اور قائم ہے اور رہے گی کہ زندگی کیسے ہی نہلکے سے کیوں نہ گذرے تہذیب انسانی کا منارہ روشن سے روشن تر ہوتا رہے گا۔

ذاکر صاحب ایسے ہی اچھے اور بڑے لوگوں میں سے تھے۔ ان کی عزت و محبت زیادہ سے زیادہ لوگوں کے دلوں میں تھی اور زیادہ سے زیادہ لوگوں کی محبت و عزت ذاکر صاحب کے دل میں تھی۔ اُن سے تکلیف شاید کسی کو نہیں پہنچی، تسلی تشفی اور تقویت ان سب کو ملی جو ان تک پہنچ سکے۔ خدا ایسے بندوں کو پسند کرتا ہے جو اس کے لاچار بندوں کی دلجوئی کرتے ہیں، ان کے حوصلے بڑھاتے ہیں اور اچھی زندگی بسر کرنے میں ان کے معین ہوتے ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ خدا خود ایسا کرتا رہتا ہے۔ اس رول کو ادا کرنے کی توفیق جن بندگان محترم کو نصیب ہوتی ہے وہ انسانیت کے محسن قرار پاتے ہیں۔ انھی محسنوں کے ساتھ جریدۂ عالم پر ذاکر صاحب کا دوام بھی ثبت ہو چکا ہے ہر سلمان اور اچھے انسان کا ایمان ہے کہ خدا کسی کے حسن عمل کو ضائع نہیں ہونے دیتا اور وہ خوش اور راضی ہوتا ہے تو اس کے عطایا کا حد و حساب نہیں رہتا۔ کچھ اور جانتا ہوں یا نہیں۔ اس پر یقین رکھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ذاکر صاحب سے راضی اور خوش رہا!

خواجہ غلام السیدین

ڈاکٹر ذاکر حسین

کس زبان سے کہوں کہ ہمارے محبوب رہنما، پریسیڈنٹ ڈاکٹر ذاکر حسین خدا کو پیارے ہوگئے اور اس کے ساتھ ساتھ میں اپنے ایک ایسے عزیز ترین دوست اور رفیق سے محروم ہوگیا جن کی زندگی اور مثال نے، جن کی گفتگو، تحریر اور تقریر نے، جن کے فکر کے حسن اور انسانیت دوستی نے، جن کی قدروں کے نادر انتخاب نے، مجھے اس قدر متاثر کیا تھا کہ آج نہ صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کی بنیادیں ہل گئی ہیں بلکہ جیسے غائب ہوگئی ہوں۔ آج سے تقریباً پچاس سال پہلے مجھے علی گڑھ میں ان سے ملنے کا شرف حاصل ہوا جب وہ کالج کے ایک نامور اور محبوب طالب علم تھے۔ ایم۔ اے میں پڑھتے تھے اور میں ایک گمنام طالب علم جو اس سال داخل ہوا تھا۔ اس دن سے آج تک محبت، عقیدت اور خلوص کے جو مراسم ان سے قائم ہوئے وہ برابر زیادہ مستحکم اور زیادہ گہرے ہوتے گئے۔ جوں جوں ان کی سیرت اور قابلیت اور جلال و جمال کے چہرے سے نقاب اٹھتی گئی یہ عقیدت اور محبت بڑھتی ہی رہی۔

میں نے اپنی زندگی میں بہت کم ایسے لوگ دیکھے ہیں جن کو ہر حالت، ہر رنگ، ہر مقام پر خالص سونا ہی سونا پایا ہو اور کہیں کھوٹ کا میل نظر نہ آیا ہو لیکن جب قدرت کسی کو اپنی فیاضی سے مالا مال کرتی ہے (اور بہت بخل کرتی ہے قدرت ایسا کرنے میں) تو پھر اس کی بخشش کی انتہا نہیں رہتی۔ کیا کیا نہیں دیا اس نے ذاکر حسین کو؟ ایسا جمال صورت جو لاکھوں میں ایک آدھ کو نصیب ہوتا ہے، ایسا جمال سیرت جو کروڑوں میں ایک آدھ کے حصے میں آتا ہے، ایسا روشن دماغ جو ہر مسئلہ کی تہ کو پہنچ جاتا، ہر پیچیدہ صورت حال میں سے مغز نکال لیتا اور ہڈیوں کو کتوں کے لیے چھوڑ دیتا، ایسا قلب گداز جس میں سارے عالم انسانیت کے لیے سمائی تھی، جو ہر کسی کی بھلائی چاہتا تھا، کسی کی برائی نہ صرف چاہتا نہ تھا بلکہ ایسا سوچ بھی نہ سکتا تھا، جو ان لوگوں کے ساتھ بھی شفقت اور پردہ پوشی کا سلوک کرتا تھا جنھوں نے اس کے ساتھ برائی کی ہو۔ گفتگو میں

وہ کشش کہ وہ کہیں اور سنا کرے کوئی۔ تقریر میں وہ روانی اور برجستگی، وہ سوز و ساز، کہ لفظ دل سے نکلتا تھا اور بجلی کی طرح دل پر گرتا تھا۔ تحریر میں وہ سادگی اور پرکاری، اور خلوص کا وہ بے پناہ جوش، جو ہر پڑھنے والے کو اپیل کرتا تھا، اور ان سب پر مستزاد وہ لطیف لیکن موثر ذوق ظرافت جو ہر قسم کے عناد اور دل آزاری سے پاک تھا اور جس کا شکار بڑی خوبصورتی کے ساتھ کبھی دوسرے لوگ اور اکثر خود ان کی ذات ہوتی تھی۔ وہ یا تو ہر بات میں ایک نئی بات پیدا کرتے اور اپنی طباعی کا ثبوت دیتے یا اگر پرانی بات بھی ہوتی تو اس کو ایک نئے انداز میں بیان کرتے کہ اس میں نئی جان پڑ جاتی۔ ان کے دماغ میں ماضی حال اور مستقبل، مذہب اور سائنس، فلسفہ اور معاشیات، قوم کی فکر اور انسانیت کا غم، جمالی دلچسپیاں اور حسن عمل کا شیوہ، سب اچھے پڑوسیوں کی طرح پہلو بہ پہلو رہتے تھے۔ انھوں نے نہ فکر حاضر سے مرعوب ہو کر کبھی مذہب کو بھلایا (مجھے بتایا گیا کہ رمضان شریف میں وہ ایک دن میں پندرہ پندرہ سپارے پڑھتے تھے اور اکثر ان کی آنکھوں سے آنسو رواں رہتے تھے) نہ مذہب کی "تنگ نظر" تعبیر کر کے اس کو حالات حاضرہ سے بے تعلق سمجھا۔ ان کا کہنا تھا کہ زندگی ایک وحدت ہے اور اس کو اسی رنگ میں دیکھنا چاہیے۔ لیکن کیا انھیں معلوم تھا کہ اس وحدت کو دیکھنے کے لیے ذاکر حسین کی نظر کی ضرورت ہے؟ ہر نظر اس وحدت کو نہیں دیکھ سکتی۔ وہ تو اس کے بے شمار پہلوؤں میں سے اپنے چند پسندیدہ اور مفید مطلب پہلو ہی دیکھ سکتی ہے۔ ان کے نزدیک ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، پارسی، یہودی سفید و سیاہ سب برابر تھے کیونکہ ایک ہی خدا کے بندے تھے۔ یاد ہو گا کہ انھوں نے صدر ہونے کے بعد جو پہلی تقریر کی تھی اس میں کہا تھا کہ ہندوستان میرا گھر ہے اور اس میں رہنے والے میرے خاندان کے لوگ۔ ان کے لیے یہ کوئی خطیبانہ دعویٰ نہ تھا بلکہ ایک زندہ حقیقت تھی جو ان کے ہر قول اور فعل سے نمایاں تھی اور وہ اس کنبہ کو صدر ہونے سے برسوں پہلے اپنا چکے تھے!

میں نے ڈاکٹر ذاکر حسین کی شخصیت کا ذکر پہلے اس وجہ سے کیا (اور کس قدر نامکمل اور تشنہ ہے یہ ذکر) کیونکہ ان کی شخصیت ان کے غیر معمولی کارناموں سے بھی زیادہ بلند تھی۔ اسی وجہ سے انھوں نے اپنی بھرپور اور عالی شان زندگی میں جن منصبوں کو سرفراز کیا، ان سے ان کی ذات میں کوئی اضافہ نہیں ہوا بلکہ ان کی ذات سے ان منصبوں کو فیض پہنچا۔ ان کے بے شمار کارناموں کا تو یہاں کیا ذکر کروں جو انھوں نے ملک اور قوم و ملت کے لیے انجام دیے لیکن ان کے چند کاموں کی طرف اشارہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ انھوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کی خدمت میں تقریباً پچیس سال بسر کیے اور اس عرصہ میں فقر و فاقہ کا لطف اپنے ساتھیوں کے ساتھ چکھا اور اس شان کے ساتھ جیسے قوم نے ان کی خدمات کا بڑا زبردست صلہ دیا ہو! اور اس ادارہ کو تعلیمی اعتبار سے نہ صرف ہندوستان میں بلکہ ہندوستان سے باہر والوں کے لیے بھی ایک ممتاز تعلیم گاہ بنا کر

دکھا دیا۔ اپنے اصولوں پر سختی کے ساتھ قائم رہے لیکن کیسی دلنوازی تھی اس سختی میں کہ سیاسی فریق جو ایک دوسرے کے انتہائی مخالف تھے سب ان کے خلوص اور ایثار و قابلیت کی وجہ سے جامعہ ملیہ کے احترام میں شریک رہے۔ اسی زمانہ میں انھوں نے گاندھی جی کی سربراہی میں بنیادی تعلیم کا ایک نقشہ ملک کے سامنے پیش کیا جس کو رفتہ رفتہ ایک حد تک مخالفین اور موافقین دونوں نے تسلیم کر لیا۔ پھر ایک نہایت نازک موقع پر علی گڑھ یونیورسٹی کی وائس چانسلری قبول کی جب ملک کی تقسیم کے بعد اس کے بہی خواہوں کو اس کے مستقبل کی طرف سے مایوسی سی ہوگئی تھی۔ لیکن انھوں نے اس کی کشتی کو طوفان میں کھیتے ہوئے، ایک مشاق ملاح کی طرح عافیت کے ساحل پر پہنچا دیا۔ یہاں سے فارغ نہیں ہو پائے تھے کہ پنڈت جواہر لال نہرو کی نگاہ انتخاب نے ان کو بہار کی گورنری کے لیے چنا اور میں نے خود وہاں کے لوگوں کو جن میں حکومت کے منسٹر بھی شامل تھے، یہ کہتے سنا ہے کہ وہ اس شان کے ساتھ ان کی ہدایت اور رہبری کرتے تھے کہ معلوم ہی نہ ہوتا تھا کہ ہم ان کے مشوروں پر عمل کر رہے ہیں پھر وہ ہندوستان کے نائب صدر بنے۔ ہر مشکل مقام پر وزیر اعظم ان سے مشورہ کرتے اور بالعموم ان کے مدبرانہ مشورے پر عمل کرتے۔ ہندوستان سے باہر کے جو سفیر۔ وزیر۔ صدر ریاست دلی آتے وہ ان کے آستانے پر حاضر ہوتے اور مرعوب اور متاثر ہو کر واپس جاتے۔ وہ کسی دوسرے ملک میں جاتے تو ہندوستان کی شہرت اور نیک نامی کو چار چاند لگا کر لوٹتے۔ اور پھر موجودہ وزیر اعظم کے ایما سے ان کا انتخاب پریسیڈنٹ کے منصب جلیلہ کے لیے ہوا اور دو سال بھی نہ ہونے پائے تھے کہ اسی منصب کے فرائض ادا کرتے کرتے آج صبح ان کے خالق نے انھیں اپنے حضور میں بلا لیا، وہ خالق جس کی رضا جوئی اور جس کے بندوں کی خدمت اور بھلائی میں انھوں نے اپنی تمام عمر بسر کی تھی۔ جن لوگوں کو انھیں قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے انھیں معلوم ہے کہ انھیں ہر وقت ملک کی بھلائی کی کس قدر فکر رہتی تھی اور جو ناگوار واقعات آج کل پیش آتے رہتے ہیں ان کے حساس دل پر ان کا کس قدر گہرا اثر تھا۔

شاید ملک میں وہی ایک شخص تھے جن کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ ہر شخص ان کی نیکی، قابلیت انسانیت اور عجز و انکسار کا معترف تھا اور ذاتی طور پر ان کا مخالف اور بدخواہ شاید کوئی بھی نہ تھا کتنی بڑی اور کتنی غیر معمولی ہے یہ بات! میں نے اپنی کتاب "آندھی میں چراغ" کے ایک باب میں ڈاکٹر ذاکر حسین کی سیرت کشی کی کوشش کی تھی اور اس کے آخر میں مندرجہ الفاظ لکھے تھے جن کو میں یہاں دہرانا چاہتا ہوں[1]

---

[1] یہ اقتباس تنگی وقت کی وجہ سے ریڈیو پر نہیں پڑھا گیا۔

"اس مضمون پر نظر ڈالتا ہوں تو خیال ہوتا ہے کہ شاید ذاکر صاحب کو اچھی طرح نہ جاننے والے یہ کہیں کہ اس شخص نے ان کے بارے میں مبالغہ سے کام لیا ہے اور شاید ذاتی مراسم فرض تنقید پر غالب آ گئے ہیں۔ دوسری طرف یہ اندیشہ دامن گیر ہے کہ ان کو قریب سے جاننے والے کہیں گے کہ اس شخص نے اتنا لکھا لیکن ان کی جیتی جاگتی، حساس اور روشن، نرم و گرم، با اصول اور گداز شخصیت کو درحقیقت قلم بند نہیں کر سکا۔ ان دوستوں کو میرا جواب یہ ہے کہ آپ خود یہ کوشش کر دیکھیے اور اگر آپ زیادہ کامیاب ہوں تو مجھے آپ سے کم خوشی نہیں ہوگی مبالغہ کا الزام لگانے والوں کی خدمت میں یہی معذرت پیش کر سکتا ہوں کہ یہ ایک ایسے شخص کے تاثرات ہیں جو طبعاً بیشتر نام نہاد بڑے آدمیوں سے متاثر نہیں ہوتا، جس کو بارہا یہ اندازہ ہوا ہے کہ عوام جن طلائی بتوں کو پوجتے ہیں ان کے نفس میں اکثر خودغرضی اور تنگی چھپی ہوتی ہے۔ مگر اس کا کیا علاج کروں کہ ذاکر صاحب کو قدرت نے جس سانچے میں ڈھالا ہے اور ان کو جن ذہنی اور اخلاقی اور روحانی صفات سے مالامال کیا ہے وہ اپنی نظیر آپ ہیں؟ اگر ایک شخص بہترین مقرر بھی ہو اور مصنف بھی، ماہر تعلیم بھی ہو اور ماہر اقتصادیات بھی، شفیق دوست بھی ہو اور راہبر بھی، اگر وہ میر کارواں کی "نگہ بلند سخن دلنواز اور جاں پرسوز" بھی رکھتا ہو لیکن لیڈری کی تنگ نظری اور خود پسندی سے پاک ہو، اگر اس کی اصول پسندی اس کی انسانیت کے گداز اور دردمندی کو کند نہ کر سکے اور اس کی مروت اور دوستی اس کی اصول پسندی کے راستے میں حارج نہ ہو، اگر وہ اپنی بیشتر زندگی فقر و ایثار کی حالت میں گذار دے اور قوم کو اس کی سزا نہ دے، قوم پر اس کا دھیان نہ رکھے، اگر کسی شخص میں یہ سب باتیں جمع ہو جائیں تو تنقید کیا کرے؟ جب اقبال کے ان اشعار کو پڑھتا ہوں جن میں انھوں نے مرد مومن کی شان بیان کی ہے تو ان کی ذہنی تفسیر ذاکر صاحب کے خد و خال سے کرتا ہوں۔ یہ بہت بڑی تعریف ہے لیکن ان کے استحقاق سے بڑھ کر نہیں۔

تجھ سے ہوا آشکار بندۂ مومن کا راز
اس کے دنوں کی تپش اس کی شبوں کا گداز
اس کا مقام بلند اس کا خیال عظیم
اس کا سرور اس کا شوق، اس کا نیاز اس کا ناز
اس کی امیدیں قلیل اس کے مقاصد جلیل
اس کی ادا دل فریب اس کی نگہ دل نواز
نرم دم گفتگو گرم دم جستجو
رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاکباز"

یہ تو مرد مومن کی تصویر تھی لیکن میرا خیال ہے کہ حالی کے مرثیۂ غالب کے مندرجہ ذیل اشعار بھی مصرع بہ مصرع، لفظ بہ لفظ ذاکر صاحب پر صادق آتے ہیں اور ان کی دل نشین انسانی شخصیت کی تصویر کشی کرتے ہیں۔ یہ ہے شاعر کا اعجاز کہ اس کے شعر ایک ان دیکھی شخصیت پر موزوں لباس کی طرح ڈھل جاتے ہیں۔

بلبل ہند مر گیا ہیہات ۔۔۔ جس کی تھی بات بات میں اک بات!
نکتہ داں، نکتہ سنج، نکتہ شناس ۔۔۔ پاک دل، پاک ذات، پاک صفات!
شیخ اور بذلہ سنج شوخ مزاج ۔۔۔ رند اور مرجع کرام و ثقات!
لاکھ مضموں اور اس کا ایک ٹھٹھول ۔۔۔ سو تکلف اور اس کی سیدھی بات!
دل میں چبھتا تھا وہ اگر بمثل ۔۔۔ دن کو کہتا تھا دن اور رات کو رات!
ہو گیا نقش دل پہ جو لکھا ۔۔۔ قلم اس کا تھا اور اس کی دوات!
تھیں تو دلی میں اس کی باتیں تھیں ۔۔۔ لے چلیں اب وطن کو کیا سوغات؟
یاں اگر بزم تھی تو اس کی بزم ۔۔۔ یاں اگر ذات تھی تو اس کی ذات!

ایک روشن دماغ تھا نہ رہا!
شہر میں ایک چراغ تھا نہ رہا!

(یہ تقریر دہلی ریڈیو اسٹیشن سے ۳ مئی ۱۹۶۹ء کو شب میں نشر کی گئی تھی اور آل انڈیا ریڈیو کے شکریے کے ساتھ شائع کی جاتی ہے۔

پوسٹر

فنِ خطّاطی

از

سید رضا حسین جونپوری خوشنویس

انجمن ترقی اردو (ہند) نے اردو فن خطاطی پر ایک دیدہ زیب پوسٹر
شائع کیا ہے
جس میں اس فن کے نادر نمونے مع ضروری قواعد دیے گئے ہیں۔

اُردو خوش خطی اور کتابت کے لیے
یہ پوسٹر بڑا کارآمد ثابت ہوا ہے
کاغذ و طباعت عمدہ ہے
قیمت صرف ۲۵ پیسے

انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ

پروفیسر آل احمد سرور

ڈاکٹر ذاکر حسین کی ادبی خدمات

افلاطون کے متعلق کہا گیا ہے کہ "اس کی شخصیت کے نظری اور عملی پہلو دونوں آکر حسن لیاقتی کمال میں مل گئے ہیں۔ مصلح اور مفکر کا تضاد آرٹسٹ کی ذات میں غائب ہو گیا ہے۔" یہ بات افلاطون کی شہرۂ آفاق کتاب "ریاست" کے اردو مترجم ڈاکٹر ذاکر حسین پر صادق آتی ہے۔

افلاطون سے لے کر برٹرینڈ رسل تک مفکرین و مصنفین کے یہاں یا تو علم کی گہرائی ہے یا ایک پیمبرانہ شان، یا حسن بیان کی چاشنی۔ یہ تینوں خصوصیات علیحدہ علیحدہ بھی اتنی ہی اہم ہیں کہ مشکل سے ایک ذات میں جمع ہو سکتی ہیں، افلاطون کو ان سب کا بھرپور حصہ ملا تھا۔ ذاکر حسین کے یہاں بھی تینوں کے ایک لطیف امتزاج نے جلال و جمال کی ایک دھوپ چھاؤں پیدا کر دی ہے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین کے یہاں ایک مفکر کی تابانی فکر، ایک معلم کی شفقت و مرحمت، ایک عاشق کا سوز و گداز، ایک مدبر کا وزن و وقار، ایک صوفی کی درویشانہ شان اور ایک مہاتما کی سی معصومیت، سب کا جلوہ نظر آتا ہے۔ علوم میں ان کی نظر ہمہ گیر اور ان کی معلومات ہمہ رنگ ہیں، فلسفہ، اقتصادیات، ادب، سائنس، تعلیم، تصوف، مذہبیات ہر موضوع پر ان کا مطالعہ گہرا اور ان کا علم حاضر ہے۔ ان کے یہاں علم صرف معلومات کا خزانہ ہی نہیں انسانیت کی اعلیٰ اقدار کی خدمت کا وسیلہ بھی ہے۔ وہ اگر صرف مصنف یا معلم ہوتے تو بھی ان کا درجہ بہت بڑا ہوتا مگر ان کی سیمابی فطرت نے کبھی تصنیف و تالیف کے گوشۂ عافیت پر قناعت نہیں کی، انھوں نے جوش جنوں میں بارہا گھر چھوڑ کر جنگل کی راہ لی اور اپنے خون دل سے کتنے ہی ویرانوں میں علم و عمل کے پھول کھلائے۔ انھوں نے کتابوں میں کبھی اپنے آپ کو بند نہیں کیا مگر جب کبھی کچھ لکھا تو اپنے خلوص، دلسوزی اور سماجی شعور کی وجہ سے الفاظ میں وہ ایسی موتی بجلیاں بھر دیں جن کی وجہ سے ادب میں آب و تاب آتی ہے اور جن سے انسانوں کی زندگی بدلتی، سنورتی اور نکھرتی ہے۔

انھوں نے بڑے بڑے خواب دیکھے مگر خوابوں کی لطافت اور رنگینی میں کھو جانے کے بجائے حقیقت کی سنگلاخ وادیوں میں یقین محکم اور عمل پیہم کے رنگ محل بنائے۔ انھوں نے اپنی بے نظیر تخلیقی صلاحیتوں سے بہت سے کام لیے، کتابیں لکھیں، خطبے تیار کیے، ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑا، بکھرے ہوئے افراد کو بلند مقاصد کا آئینہ دے کر انھیں سماجی طاقت عطا کی، شخصیتوں میں کردار کی عظمت پیدا کی۔ اداسی میں امید کی جھلک دکھلائی۔ راکھ میں شرر پیدا کیے۔ بنجر زمینوں میں پھول کھلائے۔ ذہنی توانائی کا یہ جوالا صرف کتابوں میں اپنے آپ کو کیسے بند کر سکتا تھا۔ ہاں شاید ان کی تصانیف کی خوبی کا راز یہی ہے کہ بقول مجیب "قدرتی استعداد نے زبان کو اپنا خادم بنا کر ان میں خوبیاں پیدا کر دی ہیں جو ادیبوں کی برسوں کی مشق اور محنت کے بعد نصیب ہوتی ہیں۔"

ذاکر صاحب کی پہلی قابل ذکر کتاب افلاطون کی "ریاست" کا اردو ترجمہ ہے اس کے متعلق مولانا اقبال احمد سہیل جیسے صاحب نظر کی یہ رائے قابل غور ہے کہ "افلاطون کو اردو آتی ہوتی تو وہ بھی یہی زبان اختیار کرتا" کتاب کا مقدمہ واقعی دریا کو کوزے میں بند کرنے کا ایک نادر نمونہ ہے۔ افلاطون کی تعلیم کے تمام اہم پہلوؤں سے ذاکر صاحب نے اردو دنیا کا تعارف ایسی پُر مغز، جاندار اور شگفتہ نثر میں کرایا ہے کہ پڑھ کر انسان وجد کرنے لگتا ہے۔ خود ترجمہ نہایت شستہ، رواں، سہل اور سلیس ہے۔ افلاطون کے نزدیک انسان محض انفرادی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ اپنی صلاحیتوں کو درجۂ کمال تک پہنچانے کے لیے ریاست کی کفیت کا محتاج ہوتا ہے۔ اس لیے کتاب میں اچھے انسان کی تلاش خود بخود اچھی ریاست کی تشکیل کے لیے ایک رمز بن گئی ہے اور فلسفہ، سیاست، ادب، تاریخ سب کا ایک دفتر یہیں سے ذاکر صاحب کی طبیعت کا مخصوص رنگ ظاہر ہوتا ہے۔ علم ان کے یہاں ہنرمندی کا ایک ذریعہ نہیں انسانیت کی خدمت کا ایک وسیلہ ہے۔ اور کتابیں بکھری ہوئی معلومات کا ایک انبار نہیں انسانیت کی آرائش جمال کے لیے آئینہ بن جاتی ہیں۔

جرمنی میں ذاکر صاحب مشہور معلم معاشیات پروفیسر زومبارٹ کے شاگرد تھے۔ اگر وہ اس علم پر اپنی پوری توجہ مرکوز کرتے تو ہندوستان میں اس وادی کے امام ہوتے۔ استاد نے شاگرد کو ایک افہامی طریقۂ فکر دیا جس کی مدد سے شاگرد نے اردو میں معاشیات کے مسائل کو علمی مگر شگفتہ انداز میں بیان کیا "معاشیات مقصد اور منہاج" کہنے کو ایک چھوٹی سی کتاب ہے مگر اس میں معیاری، ترتیبی اور افہامی معاشیات کے تمام بنیادی اصول نہایت دلنشیں اسلوب میں بیان کر دیے گئے ہیں۔ ذاکر صاحب نے معاشیات پر بعض مغربی مفکرین کے خیالات کا ترجمہ بھی کیا ہے مگر اس کتاب کی اہمیت پھر بھی بہت ہے۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ علمی مسائل کو صرف گمبھیر اور دقیق الفاظ میں ہی بیان کیا جا سکتا ہے ان کے لیے یہ ایک مستقل سبق ہے

اعلیٰ سے اعلیٰ موضوع عام فہم انداز میں بیان کیا جاسکتا ہے لکھنے والا چاہیے۔
ذاکر صاحب نے ترک موالات کے زمانے میں علی گڑھ چھوڑ کر جامعہ بسائی۔ جب یورپ سے واپس آئے تو جامعہ والے کس مپرسی کے شکار تھے۔ جامعہ کے قائدین سیاست کی وادیوں میں بھٹک رہے تھے اور قومی تعلیم کا یہ تجربہ دم توڑ رہا تھا۔ ذاکر صاحب نے اپنے ساتھیوں کی مدد سے اس شوق فضول کو جرأت رندانہ اور جرأت رندانہ کو عین ہوشمندی بنایا۔ قومی اور علمی بنیادوں پر تعلیم کا راستہ ہموار کیا۔ اساتذہ کی ایک جماعت تیار کی۔ طلبا میں علم کی پیاس، اخلاق کی لگن اور خدمت کی خلش بیدار کی۔ اور ستاروں کے آگے دیکھنے والی نگاہ کو ایک تعلیمی بستی کی تعمیر کے مشکل لیکن مقدس کام میں لگا دیا۔ اس تجربے، بصیرت، علم اور عرفان کا ثمرہ اردو میں وہ کتاب ہے جو تعلیمی خطبات کے نام سے شائع ہوئی۔ اس میں جا بجا ایسے بلیغ اور فکر انگیز اشارے ہیں جو مستقل تصانیف پر بھی بھاری ہیں۔ چونکہ یہ خطبے مختلف اوقات میں لکھے گئے اس لیے کہیں کہیں ان میں خیالات ہی نہیں الفاظ کی تکرار بھی ہے، جا بجا خطابت بھی اپنا زور دکھاتی ہے۔ مگر قومی تعلیم، اچھے استاد، بچوں کی تربیت، سیرت کی تربیت، ثانوی تعلیم، مسلمانوں کی تعلیم پر ذاکر صاحب نے جس طرح اظہار خیال کیا ہے اس سے ان کی اصابت رائے، بالغ نظری، حب الوطنی، سماجی شعور، نفسیاتی ژرف بینی، سب کا حیرت انگیز ثبوت ملتا ہے۔ وہ علم اور ہنر میں فرق کرتے ہیں: "جو اپنی غرض کا کام کرتا ہے وہ ہنرمند ضرور ہوتا ہے۔ مگر تعلیم یافتہ نہیں ہوتا۔ جو قدروں کی خدمت کرتا ہے وہ تعلیم پا جاتا ہے۔ قدر کی سیوا میں آدمی کا حق ادا کرتا ہے۔ اپنا مزا انہیں ڈھونڈتا" مادی وسائل کی اہمیت کو وہ مانتے ہیں مگر وہ انھیں سب کچھ نہیں سمجھتے "کون انکار کرسکتا ہے کہ روٹی کمانا زندگی کے اہم ترین کاموں میں سے نہیں ہے لیکن اس فرض کو پورا کرنے میں آدمی پر اپنی شخصیت، انفرادیت اور آدمیت کا احترام بھی لازم ہے۔" وہ تعلیم کے کام کو ایک مقدس کام سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ بھی ایک عبادت سے کم نہیں۔ فرد کو ان خوبیوں سے آشنا کرنا جو انسانیت کی ضامن ہیں اور ان کے ذریعے سے اسے اجتماعی شعور سے ہم آہنگ کرنا ان کے نزدیک انسانیت کی سب سے بڑی خدمت ہے اسی وجہ سے وہ تعلیم کو بعض اوقات سیاست سے بھی بلند درجہ دے دیتے ہیں۔ غالباً سیاست سے یہاں ان کی مراد وہ سستی سیاست ہے جو جلسوں اور جلوسوں کے چکر، انتخابات اور حکومت کے نشے سے عبارت ہے۔ ورنہ حقیقی سیاست میں تو تعلیم ایک بنیادی پتھر کا کام دیتی ہے۔ جامعہ کی جوبلی کے موقع پر انھوں نے ارباب سیاست کو مخاطب کرکے جس درد اور دکھ کے ساتھ تعلیمی کام کرنے والوں کی دشواریوں کا ذکر کیا تھا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ غلط سیاست کا دھارا تعلیم کے خاموش اور دیر طلب کام میں کیا کیا دشواریاں پیدا کرسکتا ہے، اور اس تعمیری

کام کو کس قدر صبر آزما بنا سکتا ہے ذاکر صاحب نے ان خطبات میں استاد کا جو نصب العین پیش کیا ہے وہ اس قابل ہے کہ اسے یہاں نقل کر دیا جائے کیونکہ اس سے ان کے خیالات کی اہمیت اور اسلوب کی دلکشی دونوں پر روشنی پڑتی ہے۔" استاد کی کتاب زندگی کے سرورق پر علم نہیں لکھا ہوتا محبت کا عنوان ہوتا ہے اُسے انسانوں سے محبت ہوتی ہے۔ سماج سے محبت ہوتی ہے اچھے استاد کی جذباتی زندگی میں وسعت بھی ہوتی ہے اور گہرائی بھی اور پائداری بھی، اس کی روح میں حق و صداقت، حسن و جمال، نیکی اور تقدس، انصاف اور آزادی کے مظاہر کی گرمی ہوتی ہے جس سے وہ دوسرے دلوں کو گرماتا ہے، اور جس میں تپا تپا کر اپنے شاگردوں کی سیرت کو نکھارتا ہے۔ استاد میں اہل قوت اور حکمرانوں کی سیرت کا ایک ذرہ بھی نہیں ہوتا۔ اس میں اور ان میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ حکمراں جبر کرتے ہیں اور یہ صبر کرتا ہے۔ وہ مجبور کر کے ایک راہ پر چلاتے ہیں یہ آزاد چھوڑ کر ساتھ لیتا ہے۔ ایک کے وسائل میں تشدد اور زبردستی، دوسرے کے محبت اور خدمت، ایک کا کہنا ڈر سے مانا جاتا ہے، دوسرے کا شوق سے، ایک حکم دیتا ہے، دوسرا مشورہ، وہ غلام بناتا ہے یہ ساتھی، جب ساری دنیا مایوس ہو جاتی ہے تو بس دو آدمی ہیں جن کے سینے میں امید باقی رہتی ہے ایک ماں دوسرے اچھا استاد۔"

برنارڈ شا نے کہا ہے کہ "جوش بیان اسلوب کا ابجد اور تمت ہے۔" اوپر کے اقتباسات میں خلوص، علم اعتماد اور عرفان نے الفاظ کو آتش نفسی کا گر سکھا دیا ہے، عام زبان سادہ ہے مگر جابجا دلکش ترکیبیں، مرصع فقرے دل میں اُتر جاتے ہیں اور رہ رہ کر یاد آتے ہیں۔ جذبات کا طوفان موجزن ہے مگر اظہار پر مکمل قابو ہے خیالات کی بازیگری نہیں ہے، علم کی نمائش نہیں ہے فکر انگیز خیالات اس طرح چھلکتے ہیں جیسے مینا سے آتش سیال اُبل جائے۔ طرز بیان پیترا نہیں ہے، طلسم سازی نہیں ہے۔ شخصیت کے جلوۂ صد رنگ کی آب و تاب ہے۔ اس میں مفکر کی پیشانی کا جمال، فن کار کے خون جگر کی شوخی اور ایک فرشتہ صفت انسان کی دردمندی اور دلسوزی کی گرمی اور حلاوت ہے۔ یہ طرز بیان ایک حسینہ کی بے ساختہ ادائے دلبری ہے یا ایک مجاہد کی بے جھجک تیغ آبدار، اس میں آمد ہی آمد ہے آورد کا کوسوں پتہ نہیں۔

ذاکر صاحب کے بہت سے مضامین رسالہ جامعہ کے اوراق میں دفن ہو گئے۔ کاش انھیں کوئی یکجا کر دیتا۔ رفتار زمانہ پر ان کے مضامین خصوصاً بیرون ممالک کی سیاست پر ان کے تبصرے پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ جامعہ کی جوبلی کے موقع پر انھوں نے جو خطبہ پڑھا تھا وہ بھی ان کے اسلوب کا ایک دلکش نمونہ ہے اور جامعہ کے کارناموں پر ایک روشن تبصرہ۔ سرسید، نیا علی گڑھ، حالی محب وطن کی حیثیت سے

ذاکر حسین، گاندھی جی، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری کے متعلق ان کے تاثرات، ہندوستان کیا ہے، بغرض ہماری گذشتہ پچیس سال کی ذہنی، سیاسی، تہذیبی، تعلیمی اور ادبی زندگی کے ہر اہم موڑ اور ہر فیصلہ کن لمحے بیان کے قلم سے تبصرے ہیں ان کو یک جا کر کے شائع کیا جائے تو ذاکر صاحب کا ادبی سرمایہ جوانپے موضوعات کے تنوع اپنے افکار کی گہرائی اور اپنے اسلوب کی برگزیدگی کی وجہ سے بڑے سے بڑے ادیبوں سے کم نہیں ہے، اور بھی بڑا نظر آئے گا۔ زندگی کے اس مجاہد کو قلم ہاتھ میں لے کر یکسوئی سے اپنے افکار کو کاغذ کی نذر کرنے کی مہلت کب ملی جو کچھ لکھا ہے سخت مصروفیت کے زمانے میں، مجبور ہو کر، راتیں آنکھوں میں کاٹ کر، صحت کی خرابی مول لے کر، مگر اس رواروی میں بھی ہر نقش خون جگر سے بنایا ہے اور اسی لیے اس کی آب و تاب ہمیشہ قائم رہے گی۔

ذاکر صاحب بہت کچھ ہیں مگر سب سے پہلے وہ معلم ہیں انھیں نوجوانوں سے اور بچوں سے بڑی محبت ہے۔ میں بچوں سے محبت کو بڑائی کی ایک علامت سمجھتا ہوں۔ انھوں نے نہ صرف بچوں کو انسانیت کے آداب سکھائے ہیں بلکہ ان کے لیے کہانیاں، ڈرامے، مضامین سب کچھ لکھے ہیں۔ پوری جو کڑھائی سے نکل بھاگی، مرغی جو اجمیر چلی، عقاب، ابو خاں کی بکری، جوان بوڑھے سبھی ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں۔ بچوں کے لیے یہ سیدھی، سادہ، دلچسپ کہانیاں ہیں، جوانوں اور بوڑھوں کے لیے ان میں آزادی، حب وطن، انسانیت تہذیب پر رمز و ایما کی ایک سحر کاری ہے۔ سوئفٹ نے گلیور کے سفر کی جو داستان لکھی تھی بچے اسے تفریح کی کان سمجھتے ہیں حالانکہ سوئفٹ نے قصے کہانی کے پردے میں انسان کی فطرت پر ایسے ایسے نشتر لگائے ہیں کہ سمجھنے والا تلملا کر رہ جائے۔ ذاکر صاحب طنز نگار نہیں ہیں، طنز نگار کی بے تعلقی ان کے بس کی بات نہیں۔ ان کے یہاں ایک معلم کی مرحمت و شفقت ہے، وہ انسانوں سے نہ مایوس ہوتے ہیں نہ بیزار۔ کہا جاتا ہے کہ خدا انسانوں سے ابھی تک بیزار نہیں ہوا ہے۔ خدا کی یہ صفت خدا کے اس نیک بندے کی شخصیت میں بھی جھلکتی ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں "اس میں بڑا مزا ہے کہ آدمی آدمیوں کے متعلق اچھے سے اچھا گمان رکھے اور چاہے روز فریب کھائے، ہر روز نئے سرے سے آدمیوں کی نیک دلی پر یقین کرے۔ اور عقلمندوں کو اور بے وقوفوں کو کہ دونوں گمراہ ہوتے ہیں معاف کرے۔" یہ جان کر کہ یہ فریب کھاتے ہیں جو مزہ ہے وہ بڑی سے بڑی عقلمندی میں بھی نہیں۔

ذاکر صاحب نے جامعہ میں اردو اکیڈمی کی بنیاد ڈالی۔ انھیں کی رہنمائی میں جامعہ نے اردو میں اعلیٰ تعلیم کا تجربہ کیا۔ انھوں نے ہی طالب علمی کے زمانے میں جرمنی میں دیوان غالب، رباعیات عمر خیام، اور دیوان شیدا کے خوبصورت اڈیشن ٹائپ میں شوکت کاویانی پریس برلن سے شائع کیے اور بعد میں

مکتبہ جامعہ کو سنجیدہ ادب نہایت اہتمام سے دیدہ زیب انداز میں شائع کرنے کا حوصلہ دیا۔ انھیں کی رہنمائی میں رسالہ 'جامعہ' نے برسوں اردو ادب کی خاموش اور ٹھوس خدمت کی۔ انھوں نے ہی انجمن ترقی اردو ہند کے صدر کی حیثیت سے جدید ہندوستان میں اردو کے منصب اور مقام کو واضح کیا۔ اور علی گڑھ پر اردو کا جو حق ہے وہ علی گڑھ والوں کو یاد دلایا۔ انھوں نے اپنی تحریر و تقریر سے سچی ہندوستانیت اور سچی انسانیت کا گہرا تعلق واضح کیا۔ انھوں نے ادیبوں اور شاعروں کی ہمت افزائی کی ہے، ادب کی تعلیم کے معنی اور مقصد پر روشنی ڈالی ہے، اور ادب کے ذریعہ سے ملک و قوم کی خدمت کو عبادت کا درجہ دیا ہے۔ انھوں نے ادب کو وسعت بھی عطا کی ہے، گہرائی بھی اور زندگی کی چمک دمک، تھرتھراہٹ اور گداز سے بھی آشنا کیا ہے۔ وہ جامعہ اور علی گڑھ میں شدید مصروفیات کے باوجود جدید اور قدیم علوم کے مطالعہ میں برابر منہمک رہے ہیں۔ ان کے دن انتظامی امور اور راتیں مطالعہ کے لیے وقف تھے، علمی دنیا میں علم کی ایسی پیاس اور علمی شغف میں اتنی عملی کاوشیں شاید ہی کسی کے حصے میں آئی ہوں۔ اس معلم، مفکر، مہاتما، صوفی اور علم و عمل کے پیکر کی ادبی خدمات کہاں تک گنائی جائیں جس پر اقبال کے مرد بزرگ کے یہ اشعار ہو بہو صادق آتے ہیں۔ ان کی طرف تو اشارہ ہی کیا جا سکتا ہے۔

پرورش پاتا ہے تقلید کی تاریکی میں		ہے مگر اس کی طبیعت کا تقاضا تخلیق
انجمن میں بھی میسر رہی خلوت اس کو		شمع محفل کی طرح سب سے جدا سب کا رفیق
مثل خورشید سحر فکر کی تابانی میں		بات میں سادہ و آزاد معانی میں دقیق
اُس کا انداز نظر سارے زمانے سے جُدا		اس کے احوال سے واقف نہیں پیران طریق

(یہ مضمون ذاکر صاحب کی زندگی میں لکھا گیا)

اسلوب احمد انصاری

ابو خاں کی بکری اور چودہ اور کہانیاں

ڈاکٹر ذاکر حسین کے لیے تعلیم ان کی پہلی محبت تھی لیکن ان کی دلچسپیاں گوناگوں اور متنوع تھیں۔ انھوں نے تعلیم اور معاشیات کے علاوہ، جو اُن کے خاص میدان تھے، ادب کے دائرے میں بھی اپنی طباعی اور فطانت کے جوہر دکھائے ہیں۔ وہ ہر معنی میں ایک تخلیقی ذہن اور مزاج کے مالک تھے۔ اس کا ثبوت وہ کہانیاں ہیں جو انھوں نے عرصہ ہوا رقیبہ ریحانہ کے افسانوی نام سے لکھی تھیں اور جو مئی ۱۹۶۳ء میں کتابی صورت میں یکجا شائع ہو کر منظر عام پر آئیں۔ موضوع، ہیئت اور مجموعی تاثر ہر اعتبار سے یہ کہانیاں ایک خوبصورت اور انوکھا تجربہ ہیں۔ ان میں اکثر کہانیاں انگریزی اور دوسری غیر ملکی زبانوں کے ادب سے لی گئی ہیں۔ لیکن انھیں ہندوستانی ماحول کے رنگ میں اس طرح رنگا گیا ہے اور ان کے بنیادی مواد کی ایسی قلب ماہیت کی گئی ہے کہ وہ ہمارے ہی گرد و پیش کی تصویریں معلوم ہوتی ہیں۔ بچوں کے لیے لکھی ہوئی ان کہانیوں کا رنگ روپ اور ان کی داخلی فضا اسی دیس کے باسیوں سے میل کھاتی ہے۔

یہ پندرہ کہانیاں مختلف معیار اور سطح کی ہیں۔ سعیدہ کی اماں، جولاہا اور بنیا، ماں، بے کاری، پوری جو کڑھائی سے نکل بھاگی، مرغی اجمیر چلی اور آؤ گھر گھر کھیلیں۔ ایک صاف، قابل فہم بیانیہ ڈھانچے کی اساس پر تعمیر کی گئی ہیں۔ یہ آٹھوں کہانیاں بچوں کے سادہ اور معصوم جذبات کی عکاسی کرتی ہیں۔ اور ماں باپ کے لیے ان کی جبلی محبت، ایثار اور آرزومندی کو سامنے لاتی ہیں۔ ان میں کوئی پیچ و خم نہیں ہیں۔ صورت حال (SITUATION)، فضا، کردار نگاری اور انسانی جذبات و احساسات کی مصوری، ہر چیز سے اپنایت، ہمدردی اور محبت کا رس ٹپکتا ہے۔ کرداروں میں انانیت، خود پسندی اور خود غرضی کے بجائے سادگی، بے ساختگی اور باہمی اعتماد اور بھروسہ زیادہ نمایاں ہیں۔ مثلاً سعیدہ ایک چھوٹی سی معصوم لڑکی کا کردار ہے جو اپنی ماں سے انتہائی محبت کرتی ہے اور یہ دعا کرتی رہتی ہے کہ کسی طرح سورج اپنی کرنوں کی سواری لیے اس کے گھر کے آنگن

میں صبح ہی اُتر آئے تاکہ ان کرنوں کی حیات بخش حرارت اور تازگی اس کی ماں کی تندرستی کی بازیافت کا ذریعہ بن جائے۔

"سامنے والے آم کے پیڑ کی چوٹی پر سورج کی کرنیں کھیل رہی تھیں۔ سعیدہ کی نظر اسی چوٹی پر جمی تھی۔ ایک زبان ہے جسے بڑے نہ سنتے ہیں، نہ سمجھتے ہیں لیکن بچے اسے خوب جانتے ہیں اور آپس میں یہ پیڑوں، پھولوں اور جانوروں، سورج، چاند اور تاروں بلکہ کوئی کوئی تو کہتا ہے کہ اللہ میاں تک سے باتیں کر لیتے ہیں۔ اسی زبان میں سعیدہ نے سورج کی اس کرن سے جو سب سے آخر تک آم کی چوٹی پر کھیلتی رہی، باتیں کیں کہ بہن کل صبح ضرور آنا۔ اماں کے لیے دھوپ کر دینا، نہیں تو اماں کیسے اچھی ہوں گی؟" (صفحہ ۳۹)

ان کرنوں کی سواری کا راستہ گہرے اور دبیز بادلوں کی فوج نے روک رکھا تھا، جن کے پرے کے پرے آسمان پر چھائے ہوئے تھے لیکن چونکہ ان کرنوں میں سے ایک نے سعیدہ سے دھرتی پر اُترآنے کا وعدہ کر لیا تھا، اس لیے کرنوں کے تھوڑی دیر تک لگاتار چمکتے رہنے سے بادلوں کی مزاحمت پر قابو پا لیا گیا۔

اسی طرح 'ماں' میں ماسٹر حمید کے لیے اس کی ماں کی بے اندازہ محبت اور دلار کا ذکر ہے جو انتہائی عسرت اور تنگدستی کے باوجود اپنے بیٹے کی مہمان نوازی کے لیے سات سال تک روپیہ پیسہ انداز کرتی رہی ہے تاکہ جب کبھی وہ بھولی بسری یادوں کے دل میں کلبلانے سے اس کی طرف لوٹے تو دل کھول کر اس کی پذیرائی اپنے حوصلے اور اپنی توفیق کے مطابق کر سکے۔ کہانی کا خاتمہ ان جملوں پر ہوتا ہے:۔

"ماں کی اندھی آنکھوں سے پانی کی دو چار بوندیں ٹپکیں اور اس نے ایسی آواز میں جس میں نہ جانے ملامت کا زیادہ اثر تھا یا محبت کا کہا" بیٹا تو اور یہ پوچھتا ہے! ایک ایک دن تیرے ہی انتظار میں کٹا ہے۔ سات برس میں یہ تیاری کر پائی ہوں، بیٹا، سات برس میں!" (۸۹)

"آؤ گھر گھر کھیلیں" میں بچوں کی دلچسپیوں اور معمولات کا نقشہ کھینچا گیا ہے، اور وہ اپنے تخیل کی پرواز کی بدولت جس طرح بڑوں کی حرکات و سکنات اور ان کے مشاغل کی ہوبہو نقل کرتے ہیں، انھیں بہت پُرلطف طریقے سے نمایاں کیا گیا ہے۔ یہ بچوں کی نفسیات کا بہت اچھا مطالعہ ہے۔

"بے کاری" میں ایک چھوٹی سی بچی سلیمن اپنے باپ کے کام نہ ملنے پر مسرت کا اظہار اس لیے کرتی ہے، کیونکہ اس طرح اسے تمام دن گھر میں رہنے اور اس کے کھلونوں کی مرمت کرنے کا موقع ملے گا:

"ابا یہ تو بڑا اچھا ہوا، تم آگئے۔ کبھی تو کام سے چھٹی ملی۔ آج تو دن بھر گھر پر رہو، خوب گرم گرم ذرا سو جاؤ۔ میں پاؤں داب دوں گی۔ نہیں تو یہاں گھر پر بھی تو بہت کام ہے۔ میری لکڑی کی

گڑیا کا سر ٹوٹ گیا ہے۔ وہ جو گڑیا کی گاڑی تم نے بنا دی تھی اس کا پہیہ نکل گیا ہے۔ میرے اور کھلونے بھی ٹوٹ گئے ہیں۔ اماں کو تو ٹھیک کرنا آتا نہیں۔ تم ٹھیک کر دینا۔" (ص ۹۳-۹۴)

اس چھوٹی سی بچی کو جس کا باپ ایک معمولی راج ہے اس بات کا احساس نہیں ہے کہ وہ بیکاری جسے باپ اس کے کھلونے سنوارنے میں صرف کرتا ہے اس کے اور اس کے بچوں کے لیے مالی پریشانی کا سبب بنتی ہے "جولاہا اور بنیا" میں نیک نفسی، ایمانداری اور سادگی اور اس کے برعکس خصوصیات کے درمیان تضاد کو نمایاں کیا گیا ہے۔ اس کہانی سے جو اخلاقی نکتہ ابھارنا مقصود ہے اسے بہت وضاحت کے ساتھ سیتا اور بنارسی کے کرداروں کے ذریعہ پیش کیا گیا ہے۔" پوری جو کرڑھائی سے نکل بھاگی" ایک دلچسپ تخیلی کہانی ہے اور "مرغی اجمیر چلی" میں پرندوں اور جانوروں کو استعارہ بنا کر یہ دکھایا گیا ہے کہ تحفظ ذات کا جذبہ ہمیں فوری عمل پر کس طرح اکساتا ہے۔ اس کہانی میں یہ جملہ:-

"اجمیر شریف جاتی ہوں (جاتا ہوں) نہیں تو ساری دنیا اُجاڑ ہو جائے گی۔"

جو بار بار دہرایا گیا ہے، ایک گہری حقیقت کی آئینہ داری کرتا ہے۔

"چھدو"۔ "سچی محبت"۔ اور "اندھا گھوڑا" یہ تینوں کہانیاں ایک دوسری سطح پر اہمیت رکھتی ہیں "چھدو" کو ایک طرح کی (PHANTASY) کہنا مناسب ہوگا۔ یہاں ایک چھوٹے سے لڑکے چھدو کے بے لوث تخیل کی اڑان کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ یہاں رومان کی فرضی کائنات کے سارے عناصر موجود ہیں بچے اپنے تصور میں ایک ایسی دنیا تعمیر کر لینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ جو روزمرہ کے تجربے کی دنیا سے یکسر مختلف، حد درجے کیف آور اور رنگینی و رعنائی سے مملو ہو۔ مافوق الفطرت عناصر سے جیسی دلبستگی اور زمین و آسمان کے درمیان فضاؤں کے تجربہ کا جیسا شوق بچوں کے دلوں میں چٹکیاں لیتا ہے اس کا کچھ اندازہ اس کہانی کو پڑھ کر ہوتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی ظاہر ہے کہ بالآخر ان کا رشتہ اپنا رشتہ پھر اسی زندگی سے جوڑنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور تصور میں کچھ عرصہ رومانوں کی دنیا آباد کر چکنے کے بعد اسی دنیا کی مٹی کی بو باس میں ہمیں مزا ملتا ہے:-

"یہ باتیں سن کر چھدو نے رونا شروع کیا اور اتنا رویا کہ ہچکی بندھ گئی۔ وہ بادل سے سسک سسک کر کہنے لگا۔ نہیں اب میں آسمان میں نہیں جاؤں گا۔ میں سورج کو بھی نہیں دیکھوں گا۔ مجھے اب کچھ درکار نہیں۔ مجھے تو گھر لے چلو! میں اپنی اماں کے پاس جاؤں گا۔ بس۔" (ص ۵۵)

"سچی محبت" میں محبت کے جذبے کی ایک اچھوتی اور دلکش تاویل پیش کی گئی ہے۔ "گڈریے" اور "گڈرنی" کی باہمی محبت اور گڈریے کے انوکھے تجربے سے یہ بات ثابت کی گئی ہے کہ سچی محبت روپے پیسے اور

اس طرح کے دوسرے لوازمات سے بے تعلق ہوتی ہے۔ اور اس کی بنیاد وہ پاک اور بے لوث کشش ہے جو "محبت" کرنے والوں کو ایک دوسرے کے قریب لاتی ہے :۔

"فرشتہ بولا" میری محبت کے لیے خوشی کا سامان محلوں سے نہیں ہوتا۔ میری محبت نہ بھوک کو جانتی ہے، نہ دھن دولت کو پہچانتی ہے۔ بھوک بھی خدا کی طرف سے ہے اور سونے چاندی کا لالچ بھی اور یہ سزا اس نے آدمیوں کو اس لیے دی ہے کہ پہلے محبت کرنے والوں نے محبت کے نام کو بٹا لگایا تھا۔"

"اندھا گھوڑا" جرمن زبان کی ایک کہانی کا چربہ ہے جسے ہندوستانی ماحول کے بالمقابل پیش کیا گیا ہے۔ اس سے اس وفا شعاری کا پتہ چلتا ہے، جو جانوروں کو فطری طور پر اپنے مالک سے ہوتی ہے۔ اس میں ایک عنصر انصاف جوئی کا بھی ہے جو پُرانی داستانوں کی یاد دلاتا ہے۔ "سبک سیر" میں اپنے تاجر مالک سے جو گہرا لگاؤ اور قربت ہے وہ کسی معاوضہ کی امید نہیں رکھتی۔ اس کہانی میں اس تضاد کی طرف بھی اشارہ موجود ہے جو محبت سے سرشار جانوروں اور محبت اور جذبہ تشکر اور احسانمندی سے بے گانہ انسانوں کے درمیان پایا جاتا ہے۔

"ابو خاں کی بکری" اور "عقاب" دو کہانیاں اس مجموعے میں ایسی ہیں جو بچوں ہی کے لیے نہیں، بلکہ بڑی عمر اور پختہ شعور رکھنے والوں کے لیے بھی بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ "ابو خاں کی بکری" بظاہر ایک معمولی سے آدمی کی بکری کی کہانی ہے، جو اُسے بہت ناز و نعم، رغبت اور ہمدردی کے ساتھ پرورش کرتا اور اس پر جان چھڑکتا ہے۔ اس بکری کی ظاہری ہئیت اور اس کی دلکشی اور جاذبیت کو بھی بڑی خوبی کے ساتھ نظروں کے سامنے لایا گیا ہے :۔

"یہ بکری تھی بہت خوبصورت۔ رنگ اس کا بالکل سفید تھا، بال لمبے لمبے تھے۔ چھوٹے چھوٹے کالے کالے سینگ، ایسے معلوم ہوتے تھے کہ کسی نے آبنوس کی کالی لکڑی میں خوب محنت سے تراش کر بنائے ہوں۔ لال لال آنکھیں، تم دیکھتے تو کہتے۔ ارے یہ بکری تو ہم نے لی ہوتی۔" (ص ۱۱)

لیکن چاندنی کی یہ کہانی دراصل آزادی کی لگن اور اس کے حصول کی طلب کا ایک استعارہ ہے۔ چاندنی، آزادی کی تسلیم پری ہے، جس کے گلے میں خطرے کی گھنٹی لٹکی ہوئی ہے، اس درجہ مسحور ہوتی ہے کہ اپنے آرام اور خواب و خور کی فراوانی اور ہر چیز کو اس پر قربان کر دینے میں کسی تامل اور تذبذب کو راہ نہیں دیتی۔ دراصل بکری کی یہ کہانی فی نفسہ اتنی اہم نہیں، جتنی اس حقیقت کی ترجمانی کہ آزادی کتنی حسین اور

دل موہ لینے والی شے ہے۔ یہ بات کچھ تو اسی جد و جہد کے ذریعے نمایاں کی گئی ہے جو بکری آزادی حاصل کرنے کے لیے کرتی ہے، اور کچھ اس فضا کی تعمیر کے توسط سے جو اس کہانی میں از اول تا آخر موجود ہے۔ بہت پہاڑوں کی کھلی ہوئی فضائیں اور سبزے سے ڈھکی ہوئی ان کی چھاتیاں، آزادی کی مست کر دینے والی دولت کا اشارہ ہیں، اور نیچے وادی میں باڑے اور کانٹوں کا گھیر غلامی اور بے دست و پائی کا نشان ہیں۔ کالی کالی آنکھوں والا بھیڑیا موت کی ایک واضح علامت ہے اور یہ پُرخطر آزادی کے ساتھ منسلک ہے۔ پہاڑ اور وادی سے متعلقہ فضا کو پہلو بہ پہلو رکھنے سے آزادی اور غلامی کو بہ حیثیت دو ذہنی کیفیتوں کے یوں ابھارا گیا ہے:۔

"اور چاندنی نے دل میں کہا" وہ پہاڑ کی چوٹیاں کیسی حسین ہیں۔ وہاں کی ہوا اور یہاں کی ہوا کا کیا مقابلہ۔ پھر وہاں اچھلنا، کودنا، ٹھوکریں کھانا اور یہاں ہر وقت بندھے رہنا۔ گردن میں آٹھ پہر یہ کم بخت رسی ایسے گھیروں میں گدھے اور خچر بھی بھلے چنگ لیں۔ ہم بکریوں کو تو ذرا بڑا میدان چاہیے۔" (ص ۱۲-۱۳)

"عقاب" میں اس استعارے کو مزید طول دے دیا گیا ہے۔ یہاں کہانی کا کہانی پن تو صرف اس دوستی سے جھلکتا ہے جو عقاب اور بلی کے بچے منّو کے درمیان اتفاق سے پیدا ہو گئی ہے لیکن درحقیقت پوری کہانی کی جان عقاب کی شخصیت ہے جو آزادی، استغنا، خودداری اور خودنگری کی ایک بین علامت ہے عقاب سے روایتی طور پر ہمیشہ تنہائی، حمیت اور آزادہ روی کو منسوب کیا گیا ہے۔ عقاب کی اپنی دنیا الگ ہوتی ہے۔ اسے اپنی برتری اور قوت کا شدید احساس ہوتا ہے۔ وہ زمانے کے گرم و سرد اور اس کی بہار و خزاں سے متاثر نہیں ہوتا بلکہ ہر منظر پر ایک چھچھلتی سی نظر ڈال کر گزر جاتا ہے۔ یہ عجیب قسم کا پرندہ ہے جو کسی سے مرعوب ہونا نہیں جانتا اور اپنی خودشناسی اور خود اعتمادی کے بل بوتے پر تکیہ کرتا ہے۔ اس کے متعلق کہانی میں یہ تراشہ بڑی اہمیت رکھتا ہے:۔

"جب ہوا میں ننھے ننھے سفید روئی کے گالے سے ناچتے دکھتا، یا برف سے ڈھکی ہوئی سفید سفید چھتوں پر اس کے بازوؤں کا کالا سایہ اسے دکھائی دیتا تو یہ سمجھ جاتا تھا کہ اب سردی کا زمانہ آگیا پھر پیڑوں کی کالی کالی ننگی شاخوں پر ہلکا ہلکا ہرا لباس دکھتا اور چڑیوں کا چہچہانا اور مست ہو ہو کر گانا سنتا تو جان لیتا کہ بہار آگئی۔ میدان میں ہرنوں کے غول کے غول چوکڑی بھرتے دکھائی دیتے اور چٹان کے پاس سے دریائی پرندوں کے پرے کے پرے گرم ملکوں کے سفر کے قصد سے گزرتے تو یہ تاڑ جاتا کہ خزاں کی سواری آنے کو ہے۔ کوئی آئے، کوئی جائے اس کی زندگی جیسی آج ویسی کل۔ وہی چٹان، وہی تنہائی، وہی قوت کا احساس، نہ کسی کو سہارا

دینے کا موقع، نہ کسی سے مدد لینے کی ضرورت، بس اپنی دنیا آپ۔" (ص ۲۵)

یہاں بھی فضا آفرینی کہانی کی تنظیم میں ایک بہت اہم عنصر ہے۔ ایک طرف جو ڑے چپکلے پہاڑوں کی برف آلود اور فلک پیما چوٹیاں ہیں جو ستاروں کی رازدار بھی ہیں اور مہیب سناٹوں کی امین بھی، اور دوسری طرف وہ گرم، آرام دہ، محفوظ اور سکون پرور ماحول ہے جو گھروں کی چہار دیواری سے وابستہ ہے اور جس میں منّو قلانچیں بھرتی پھرتی ہے۔ دراصل عقاب اور "بلی کے بچے" کی فطرت کے درمیان اور پُرشکوہ پہاڑوں اور سطحِ زمین پر بنے ہوئے مکانوں کی فضا کے درمیان تضاد ہی کے ذریعے سے کہانی کے اصل منشا کو سامنے لایا گیا ہے۔

علاوہ اخلاقی اور انسانی صفات پر زور دینے کے، ان کہانیوں میں تین عناصر خاص طور پر قابلِ توجہ ہیں۔ اول رومان اور تحیر کی وہ معصوم اور دل گرفتہ فضا جو بچوں کے عنصری جذبات کو اپیل کرتی ہے، دوسرے جانوروں اور پرندوں سے وہ محبت جو بچوں، بڑے فن کاروں اور تخلیقی ذہن رکھنے والوں کے درمیان مشترک ہوتی ہے اور تیسرے فطرت کے مظاہر سورج، چاند، تاروں اور دریاؤں، پہاڑوں اور سبزہ زاروں کی طرف وہ کشش جو ہم سب محسوس کرتے ہیں۔ لیکن جس کے حسن کی پرچھائیوں کو صرف شاعر اور مصور کا موقلم ہی اسیر کرسکتا ہے۔ ان کہانیوں میں کہانی پن تو ایسا زیادہ نہیں ہے، اور نہ صورتِ حال پر وہ مضبوط گرفت ہے جس سے کہانی کا تانا بانا تیار ہوتا ہے لیکن تاثر آفرینی ہر جگہ ملتی ہے۔ ان کہانیوں کے لکھنے سے ڈاکٹر ذاکر حسین کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ بچوں کی دلچسپیوں سے اپنے آپ کو پوری طرح اہم آہنگ کرکے انھیں حرف و صوت کے ذریعہ صفحۂ قرطاس پر ابھاریں اور بچوں کو اپنا ہمدم و دمساز بنائیں۔ بچوں کو گہری دلچسپی یا تو گرد و پیش کی اشیا سے ہوتی ہے یا اپنے ماں باپ سے یا جانوروں، پرندوں کی مدد سے اور بعض اوقات وہ اپنے ماحول سے رشتہ توڑ کر اپنے تخیل کی اس دنیا میں بھی پناہ لینا چاہتے ہیں جس کے اور چھور کا پتہ نہیں۔ اس دنیا میں شوخ و شنگ رنگوں، جادو کی کراماتوں اور فطرت کے بے داغ حسن و جمال کو بھی بڑا دخل ہوتا ہے۔ اور ان کہانیوں میں ان تمام عناصر سے کام لیا گیا ہے۔ تعجب ہوتا ہے کہ ڈاکٹر ذاکر حسین معاشیات اور فلسفۂ تعلیم جیسے خشک اور ٹھوس موضوعات میں ڈوبے رہنے کے باوجود کبھی کبھی اپنے تخیل کی زرخیزی، مشاہدے کی باریک بینی اور نفسیاتی مطالعے کی حسن کاری کو استعمال کرکے اپنے خیال اور قلم کا رُخ ایسی ہلکی پھلکی چیزوں کی طرف بھی موڑ سکتے تھے اور ایسی جیتی جاگتی تصویروں کی تخلیق پر قدرت رکھتے تھے۔

رحم علی الہاشمی

ذاکر صاحب

ڈاکٹر ذاکر حسین خاں مرحوم سے میری پہلی ملاقات اس وقت ہوئی جب وہ جامعہ ملیہ کے شیخ الجامعہ تھے۔ یہ کوئی قریب چالیس سال پہلے کی بات ہے۔ اس دوران میں وہ زینہ بزینہ ترقی کے منازل پر بڑھتے رہے اور مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر سے بہار کے گورنر اور پھر نائب صدر جمہوریہ اور بالآخر ملک کے اعلیٰ ترین رتبہ صدر جمہوریہ کے درجے تک پہنچ گئے۔ اس دوران میں مختلف مدارج پر مجھے ان سے ملنے کا اتفاق ہوا مگر جب بھی ملا وہ اسی شفقت و اخلاص سے ملے جیسے پہلی ملاقات میں ملے تھے حتیٰ کہ راشٹرپتی بھون میں بھی وہ رخصت کرتے وقت مجھے دروازے تک پہنچانے آئے۔ یہ اخلاص و اخلاق دنیا کے شاذ و نادر افراد ہی میں نظر آتا ہے اور میں نے تو اسے کہیں نہیں دیکھا صرف ایک آدھ لوگوں سے سنا ہے۔ اسی خلق و خلوص کے ساتھ ان کی ساری زندگی بھی شروع سے آخر تک تصنع اور نمائش سے پاک تھی اور جس سادگی سے وہ جامعہ میں رہتے تھے جہاں انھوں نے اپنے سارے وسائل جامعہ میں لگا دیے تھے اور تنگی سے بسر کر رہے تھے اسی طرح وہ راشٹرپتی بھون کے وسیع و پرشکوہ محل میں بھی سادگی کا نمونہ نظر آتے تھے۔ اگرچہ ان کا جمالیاتی احساس بہت بڑھا ہوا تھا جس کا اظہار ان کے جامعہ کے مکان سے لے کر راشٹرپتی بھون تک کی زیبائش و خوشنمائی میں ظاہر ہوتا تھا خاص کر ان کا پھولوں کا شوق اور گلاب سے خاص انسیت ہر جگہ اور ہر موقع پر نمایاں رہی اور اگر اپنے گھر میں وہ خود احاطے کے باغ میں کام کرتے تھے تو راشٹرپتی بھون میں مغل گارڈن کی خاص طور پر نگرانی کرتے تھے جس سے تھوڑے ہی دنوں میں اس کی حیثیت بدل گئی اور پھولوں کی کیاریاں مہکنے اور جگمگانے لگیں۔ پھولوں کے شوق کے علاوہ ذاکر صاحب کو نوادرات کے جمع کرنے کا بھی شوق تھا اور اس سلسلے میں انھوں نے ایک چھوٹا سا عجائب خانہ بنا لیا تھا جسے ایک مرتبہ انھوں نے بڑی دلچسپی سے مجھے دکھایا اور ایک ایک چیز کی تاریخ اور خصوصیت بیان کی۔ اپنی مصروف

زندگی سے اتنا وقت نکال کر مجھے اپنے جمع کیے ہوئے عجائبات دکھانا ان کی خاص دلچسپی اور میرے ساتھ شفقت کا اظہار تھا۔

جامعہ کی زندگی کے بعد جب ذاکر صاحب کو آمدنی ہونے لگی تو اس کا بیشتر حصہ وہ خیر خیرات میں صرف کرتے تھے اور خود نہایت سادگی سے بسر کر کے بیسیوں طالب علموں اور بیواؤں وغیرہ کی مستقل امداد کرتے رہتے تھے جس کا کسی کو علم نہ تھا اور اب ان کے انتقال کے بعد معلوم ہوا کہ اس کا حلقہ کتنا وسیع تھا۔ اور کتنے لوگ ان کے انتقال کے بعد بے آسرا ہو گئے عسرت و فراغت کے زمانوں کی یہ سخاوت ایک ایسی صفت ہے جس کا اسلام میں بہت بلند رتبہ ہے۔ اسی کے ساتھ وہ راسخ العقیدہ مسلمان تھے اور اپنے عقائد پر عامل بھی تھے۔ صوم و صلوٰۃ کی پابندی تقریباً آخر تک قائم رہی اور رمضان میں بکثرت کلام مجید کی تلاوت فرماتے تھے بلکہ تین دان میں پورا قرآن ختم کرتے تھے۔ اس مبارک مہینے کے احترام میں راشٹرپتی بھون جانے والوں کی دن کے وقت چائے وغیرہ سے ضیافت نہیں ہوتی تھی۔ چھوٹوں پر شفقت کا نمونہ ان کے ملازم خاص اسحٰق ہیں جن سے انھوں نے کبھی سخت لہجہ میں بات نہیں کی اور عام طور بھی ہر شخص سے ملائمت و اخلاق سے بات کرتے تھے اور اگر کوئی ان سے گستاخی بھی کرتا تھا تو اس سے برافروختہ نہیں ہوتے تھے۔ غرضکہ ذاکر صاحب کی زندگی قرون اولیٰ کے مسلمانوں کا نمونہ تھی اور اگرچہ مرنے کے بعد جزا و سزا کا معاملہ اللہ تعالیٰ نے بالکل اپنے ہاتھ میں رکھا ہے تاہم ظاہری حالات کی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ اعلیٰ علیئین کے مراتب پر فائز ہوں گے۔

علمی اور تعلیمی مصروفیتوں کی وجہ سے ذاکر صاحب کو تصنیف و تالیف کا زیادہ موقع نہیں ملا مگر جو بھی چند کتابیں ان کی یادگار ہیں وہ ان کی عظمت ثابت کرنے کو کافی ہیں اور پھر تحریر و تقریر میں ان کی اولیت مسلم ہے۔ چنانچہ جامعہ کی سلور جوبلی کے موقع پر انھوں نے جو تقریر کی تھی وہ ایک عظیم شاہکار ہے اور اس جوبلی میں ہر نقطۂ خیال کے زعما کا اجتماع بھی ان کی مقبولیت عام پر دال تھا اس لیے کہ ایسا اجتماع اس کے پہلے یا بعد کو کہیں دیکھنے میں نہیں آیا جس زمانے میں کرنیل بشیر حسین زیدی مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے اور انھوں نے ذاکر صاحب کو جلسہ تقسیم اسناد کی صدارت کے لیے بلایا اور موزوں الفاظ میں ان کا تعارف کرایا تو ذاکر صاحب نے ذرا سے تغیر کے ساتھ میر کا یہ شعر پڑھا۔

پتہ پتہ بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

یہ ان کی ذہانت اور فن تقریر کی مہارت کی اعلیٰ ترین مثال ہے۔

ایک مرتبہ میں نے اپنے ایک نواسہ کی بسم اللہ ذاکر صاحب سے کرانا چاہی تو انھوں نے باوجود اپنی مصروفیتوں کے اس کے لیے وقت دیا اور میری معذرت پر فرمایا کہ یہ بھی تو ایک کام ہے۔

انتظامی معاملات میں ذاکر صاحب عموماً اپنے ماتحت عملہ پر اعتماد کرتے تھے اس میں بعض اوقات کچھ بے عنوانی بھی ہو جاتی تھی مگر اس کی ذمہ داری ماتحت عملہ کی تھی اور ذاکر صاحب کے اعتماد سے ایک طرف تو ان کی شرافت نفس ظاہر ہوتی تھی اور دوسری طرف عموماً اس کا نتیجہ بھی اچھا نکلتا تھا۔ اور وہ عملے کی پارٹی بازیوں سے بلند رہتے تھے۔ جامعہ ملیہ اور مسلم یونیورسٹی دونوں جگہ انھیں اس قسم کی پارٹی بازیوں سے سابقہ پڑا لیکن ان کے بلند کردار پر کبھی کسی کو حرف زنی کی جرأت نہ ہو سکی۔

ذاکر صاحب کی خانگی زندگی بھی ان کی پبلک زندگی کا نمونہ تھی اور ان کے اہل خاندان کو کبھی اس کی شکایت نہیں ہوئی کہ انھوں نے کسی سے بھول کر بھی کوئی سخت بات کہی۔ ان کی بیگم صاحبہ آخر وقت تک کوئی نہ کوئی چیز ان کے لیے خود پکاتی رہیں جس کا سلسلہ راشٹرپتی بھون میں بھی جاری رہا اور آخری ہانڈی پوری پکی نہ تھی کہ ان کے انتقال کی وجہ سے یوں ہی اتار دی گئی۔ بیگم صاحبہ کا یہ سلوک یقیناً ذاکر صاحب کے سلوک کا جواب ہو گا۔

متقی اور پرہیزگار کی صفت کا اگر کسی ایک ذات پر اطلاق ہو سکتا ہے تو وہ ذاکر صاحب کی ذات تھی اور ان کے حق میں ان کے پسماندگان کی دعائیں یقیناً درجۂ اجابت کو پہنچی ہوں گی۔

انجمن کی چند مطبوعات

۱۔ یادگار نظر	جگر بریلوی	۶٫۵۰
۲۔ تین مغربی ڈرامے	مجنوں گورکھپوری	۷٫۰۰
۳۔ خواب شیریں	جے کرشن چودھری	۲٫۰۰
۴۔ کچھ زر کی بابت	ابو سالم	۴٫۰۰
۵۔ کلیات شاہی	سید مبارز الدین رفعت	۳٫۰۰
۶۔ کلام سودا	خورشید الاسلام	۶٫۰۰
۷۔ گل کرسٹ اور اس کا عہد	محمد عتیق صدیقی	۷٫۰۰
۸۔ گاندھی اور نہرو کی راہ	ڈاکٹر سید عابد حسین	۵٫۰۰
۹۔ مذہب اور دھرم	مہاتما گاندھی	۴٫۰۰
۱۰۔ مشترکہ زبان	"	۴٫۵۰
۱۱۔ مضامین رشید	رشید احمد صدیقی	۶٫۰۰
۱۲۔ نسیم مغرب	اے سی۔ بہار	۲٫۵۰
۱۳۔ اردو مثنوی شمالی ہند میں	ڈاکٹر گیان چند جین	۱۷٫۰۰
۱۴۔ سخن مختصر (نیا مجموعۂ کلام)	معین احسن جذبی	۲٫۰۰
۱۵۔ سیر افلاک	حکیم احمد	۵٫۰۰
۱۶۔ شاد کی کہانی شاد کی زبانی	محمد مسلم	۵٫۰۰
۱۷۔ صحیفۂ خوشنویسان	مولوی احترام الدین شاغل	۶٫۰۰
۱۸۔ فرانسیسی ادب	ڈاکٹر یوسف حسین	۱۳٫۰۰
۱۹۔ فائز دہلوی اور دیوان فائز	مسعود حسن رضوی	۵٫۵۰
۲۰۔ فن تحریر کی تاریخ	محمد اسحاق صدیقی	۷٫۵۰
۲۱۔ باپو کے قدموں میں (مکمل)	ڈاکٹر راجندر پرشاد	۱۵٫۰۰
۲۲۔ بازدید	منیب الرحمٰن	۳٫۵۰

انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ

ڈاکٹر ضیاء الدین احمد صدیقی

ذاکر حسین ایک معاشی کی حیثیت سے

ڈاکٹر ذاکر حسین کو ایک ماہر معاشیات یا معاشی کہنا اس معنی میں جس میں یہ اصطلاح پیشہ ور معاشعین کے لیے عام طور پر استعمال ہوتی ہے غالباً صحیح نہ ہو۔ معاشیات ذاکر حسین کی "پہلی محبت" کبھی نہیں رہی گو اس سے شغف ان کو ساری عمر رہا۔ یہ عجیب و غریب شخص جسے نوادرات سے لے کر باغبانی اور پھول نادر پتھر، وصلیاں اور کتبے، مصوری اور فن تعمیر سب سے یکساں دلچسپی تھی، معاشیات کے طلسم کا اسیر نہ ہو سکا۔ وہ ماہر تعلیم کی حیثیت سے ملک میں زیادہ مشہور تھے اور ایک تعلیمی ادارہ کی قیادت کی وجہ سے تعلیمی معاملات سے متعلق ان کی رائے ہمیشہ وقیع سمجھی گئی۔ بہت سے لوگوں کو غالباً یہ علم بھی نہ ہو کہ وہ معاشیات میں ایم۔ اے اور پی۔ ایچ۔ ڈی تھے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی برلن یونیورسٹی سے حاصل کی تھی، جہاں اس زمانے کے مشہور مفکر ورنر زومبارٹ جامعہ برلن میں معاشیات کا درس دیتے تھے۔ انھوں نے جامعہ ملیہ میں معاشیات کی تدریس کی اور ایڈون کینن کی کتاب مبادی معاشیات کے نام سے ترجمہ کی۔ اس کے بعد مختلف اوقات میں معاشیات پر خطبات دیے یا معاشیات کی کتابوں کا ترجمہ کیا، جو چھپے اور ملک میں قدر کی نگاہوں سے دیکھے گئے۔ مترجم کی حیثیت سے انھوں نے حق ترجمہ ادا کیا، اور ان کے ترجمے اپنے اسلوب کے لحاظ سے تصنیف کے درجے تک پہنچے ہوئے متصور کیے گئے۔ ان کے خطبات جو اگرچہ ان کے استاد کی تحقیق و تنقید پر مبنی ہیں، طرز فکر اور موضوع کی وسعت کے لحاظ سے ہندوستانی دانشوروں کی دلچسپی کا باعث ہیں۔ ہندوستانی معاشعین اور ہندوستانی دانشور جتنے انگریزی زبان سے واقف ہیں اتنے کسی اور یورپین زبان سے نہیں، بیرونی زبانوں سے شغف گذشتہ دس سال سے ملک کے اندر بڑھا ہے۔ اس لیے جرمن مفکروں کی تحقیق پر مبنی کتابیں ہندوستانیوں کے لیے ایک نئے انداز فکر اور تحقیق اور تنقید کے ایک نئے معیار کو قائم کرنے کی دعوت دیتی ہیں۔ موخر الذکر خود ہی ایک بڑی خدمت ہے اور ناانصافی ہوگی اگر اس کا یہاں اعتراف نہ کیا جائے۔

معاشیات پر ترجمہ اور تصنیف جو کتابیں ہماری نظر سے گزری ہیں وہ یہ ہیں۔ مبادیٔ معاشیات (ترجمۂ کینن) معاشیات، مقصد اور منہاج (شائع شدہ ہندستانی اکیڈمی الہ آباد) سرمایہ داری (خطبات دہلی یونیورسٹی) اور فریڈرش لسٹ کی کتاب معاشیات قومی کا ترجمہ۔ ان میں معاشیات: مقصد اور منہاج اور سرمایہ داری ان کی تصنیف کہی جاسکتی ہیں۔ اس سلسلہ میں یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ یہ خطبات بالخصوص جرمن مفکروں کے افکار پر مبنی ہیں۔ لیکن ان میں آب و رنگ، طرزِ نگارش، مفکرانہ اسلوب اور خطیبانہ آنچ، سب ان کی فضیلت کا کرشمہ اور افلاطونی شخصیت کے مظاہر ہیں۔ ان کتابوں کا مطالعہ ہمیں سب سے پہلے ایک "انسان پرست" شخصیت سے متعارف کراتا ہے اور پھر ہماری توجہ اسلوب کی طرف پھیرتا ہے۔ اس لیے ہم سب سے پہلے ان کتابوں کے اس خاص رخ پر روشنی ڈالیں گے اور پھر موضوع اور دیگر خصوصیات سے بحث کریں گے۔

ذاکر حسین کی شخصیت کی سب سے نمایاں صفت "انسان پرستی" ہے، یہ اصطلاح ہم اس معنی میں استعمال کررہے ہیں جس میں عام طور پر ادبیات میں سمجھی جاتی ہے۔ یہ ایک تحریک تھی جو دورِ وسطیٰ کے ختم اور دورِ جدید کے شروع میں یورپ بالخصوص اٹلی میں سب سے پہلے ظاہر ہوئی اور جس کا سب سے ممتاز نمائندہ اور پیداوار ایراسمس تھا۔ ان کی انسان پرستی تمام خواہشات کو قبول کرنے، زندگی میں توازن پیدا کرنے، تنوع اور گوناگوں دلچسپیوں سے لگاؤ رکھنے میں ظاہر ہوتی تھی۔ انسان پرستی کسی مافوق الفطرت مظہر کی سند نہیں مانتی بلکہ وہ انسان کے اعمال اور افکار کو بذاتہ مستند سمجھتی ہے یہ دراصل ایک نقطۂ نظر اور ایک ترکیبی عمل ہے جو کسی ایک فن میں اپنے آپ کو محصور رکھنے پر قانع نہیں۔ جو بیکن کی طرح یہ کہتی ہے کہ تمام علم میری دسترس میں ہے۔ اس کے اثر سے ذاکر حسین کی شخصیت میں گرمی اور روشنی ملتی ہے۔ ان سے جو لوگ ملنے جاتے تھے وہ مختلف تاثرات لے کر لوٹتے تھے۔ کچھ لوگ انھیں معمہ سمجھتے تھے۔ کچھ بہت متاثر ہوتے تھے اور کچھ منکر۔ یہ شخص جسے اپنے اوپر مکمل قابو تھا۔ اپنے اندر بہت سے طوفانوں کو متحرک رکھتا تھا۔ یہ مسحور کن شخصیت دلنوازی کے ساتھ بڑی معترض تھی۔ خاکساری کے ساتھ فروتنی، نرمی کے ساتھ ایک قسم کا اکھڑ پن، قبول کے ساتھ رد اور رد کے ساتھ قبول، اس کا شیوہ تھا۔

شخصیت کا یہ اثر اسلوب میں پورے طور پر ظاہر ہوتا ہے۔ تفکر کا عنصر موضوع پر مکمل عبور اور تمام متعلقہ جزوی معلومات سے شناسائی سے ظاہر ہوتا ہے۔ الفاظ کا انتخاب اور ان کا زیر و بم، ان کی باہمی تنظیم اور ثقالت سے بری ہونا، اس اسلوب کی نمایاں صفات معلوم ہوتی ہیں۔ زبان تاثرات کے جادو جگاتی ہے اور خیال نئے اور وسیع ترمیدانوں میں بھٹکنے لگتا ہے۔ اس میں خطیبانہ

گرمی، مزاج کی چاشنی، سنجی گفتگو کا لطف، خلوص اور سنجیدگی جیسی متضاد صفات ملی جلی نظر آتی ہیں۔ یہ نثر ایک محقق کی خشک اور بے جان نثر نہیں ہے جس میں واقعات اور اعداد و شمار کا ٹھوس پن ظاہر ہو۔ نہ یہ اتنی تند جبیں ہے کہ مزاح اور خوبصورت الفاظ اور برمحل اشعار کے انطباق کے زیورات سے اپنے آپ کو آراستہ کرنا باعث ننگ سمجھے۔ نہ یہ اتنی ہلکی پھلکی ہے کہ اسے پڑھنے کے بعد آدمی بھول جائے۔ یہ اسلوب ترجمہ اور تصنیف دونوں میں ملتا ہے اور پڑھنے والے پر ایک اچھا اثر چھوڑ جاتا ہے جو شگفتگی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے[۱۵]

(۲)

ذاکر حسین کی کتابوں کو ہم دو حصوں میں منقسم کر سکتے ہیں، ترجمہ اور تصنیف پہلے ہم ترجمہ کو لیں گے ان میں مبادی معاشیات اور معاشیات قومی شامل ہیں۔

مبادی معاشیات کے متعلق کچھ زیادہ نہیں کہنا ہے۔ یہ ایڈورن کینن کی کتاب ELEMENTARY POLITICAL ECONOMY کا اردو ترجمہ ہے، اور سب سے پہلا ترجمہ ہے جو انھوں نے کسی معاشی کتاب کا کیا۔ یہ مطبع جامعہ طبیہ سے ۱۹۲۲ء میں شائع ہوا۔ ترجمہ صاف ستھرا اور رواں ہے اور عام معاشی مسائل کا تذکرہ ہے جو آسان اور عام فہم زبان میں طالب علموں اور معاشیات سے ناواقف اشخاص کے لیے تعارف کا کام دے سکتا ہے۔ آج کل کے طالب علم کے لیے اس کی حیثیت محض تاریخی ہے کیونکہ علم معاشیات کے بڑھنے اور ترقی کرنے ساتھ ساتھ موضوعات میں تنوع پیدا ہو گیا ہے۔ معاشیات اگر ایک طرف نظریۂ قیمت، قومی آمدنی سے متعلقہ مسائل کو موضوع بحث بناتی ہے تو دوسری طرف زرعی معاشیات، عوامی مالیات اور معاشی ترقی وغیرہ کے مسائل کا احاطہ کرتی ہے۔

ان کا دوسرا ترجمہ فریڈریش لسٹ کی مشہور کتاب معاشیات قومی کو اردو کا جامہ پہنانا ہے، یہ ۱۹۲۷ء میں لاہور سے شائع ہوا اور ایک پختہ عمر کا کرشمہ ہے۔ لسٹ کی یہ کتاب معاشی تفکر کی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کا اردو ترجمہ کر کے ذاکر حسین نے اردو داں طبقہ کی ایک خدمت کی ہے۔ اس کتاب نے معاشیین پر اتنا گہرا اثر ڈالا ہے کہ اس کے بعض نظریات مقبول عام نظریات میں شامل ہو گئے ہیں اور آج اس کتاب کو پڑھتے وقت ان خیالات کی جدت ہمیں محسوس تک نہیں ہو پاتی۔ اس کتاب پر ہم قدرے تفصیل سے بحث کریں گے۔

تعارف میں مترجم نے مصنف کی مختصر سوانح عمری، اس پر جن واقعات نے گہرا اثر ڈالا، کتاب کے لکھے جانے میں جن عوامل نے کام کیا، اور اس کتاب نے جو اثر معاصر اور بعد کو آنے والی نسلوں پر ڈالا،

سب کا مختصر جائزہ لیا ہے ۔ یہ ترجمہ دوسری جنگ عظیم کے خاتمے پر شائع ہوا ۔ شروع کے چند جملوں میں سے ایک جملہ ہے : "اس [کتاب] کے مصنف نے شدید علالت اور آلام روزگار سے تنگ آکر جون ۱۸۴۶ء میں خودکشی کر لی تھی ۔ یہی نہیں بلکہ جس جرمن قومی معیشت کی تعمیر میں اس کا حصہ شاید ہی کسی سے کم نہ تھا وہ بھی قیادت عالم کے جوئے میں اپنے وجود قومی کی بازی لگا کر ہار چکی ہے ۔ لوگ کہتے ہیں کہ اس نے بھی خودکشی کر لی ۔" یہ گویا لسٹ کے جرمنی اور بعد از جنگ کے مفتوحہ جرمنی کے حالات میں مطابقت کا تذکرہ ہے ۔ ہندوستان اور دیگر غیر ترقی یافتہ قوموں کی معیشت کی ترقی میں اس کتاب سے کیا مدد مل سکتی ہے یہ اس طرح بیان کیا گیا ہے : " پھر یہ کتاب کیوں شائع کی جا رہی ہے ؟ اس لیے کہ انسانی زندگی کے اکثر مسائل مختتم طور پر حل نہیں ہوتے ۔ بار بار نیا روپ لے کر سامنے آتے ہیں اور دعوت تلاش دیتے ہیں .... معاشی نظم کی از سر نو ترتیب کا سوال دنیا کے سامنے ہے .... ساتھ ہی نئی قومیں جو زندگی کی دوڑ میں اوروں سے پیچھے تھیں اب عالمی تعمیرات سے آگے بڑھنے کا حوصلہ کر رہی ہیں ۔ اپنی معیشتوں کو مضبوط کرنا چاہتی ہیں ۔ لیکن آزاد تجارت کے پرانے خیال کے ساتھ آزاد معیشت کا جو خیال تھا وہ اب کسی کو بھاتا نظر نہیں آتا ۔ ریاست اور معیشت کے تعلق کے باب میں اہل عمل اور اہل فکر دونوں ہی کا رجحان ریاست کی مداخلت کی حمایت میں معلوم ہوتا ہے ۔"

لسٹ کی یہ کتاب انگریزی کلاسیکل معاشی اسکول کے نظریات کے مقابلہ میں ردعمل کے طور پر پیش کی جا سکتی ہے ۔ ۱۸۴۴ء کا جرمنی ایک منقسم جرمنی تھا ۔ جہاں چھوٹی چھوٹی خود مختار ریاستیں اور ان کی آزادانہ پالیسی قومی یک جہتی اور قومی ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تھیں ۔ یہاں بھی صنعتی انقلاب رونما نہیں ہوا تھا اور اس کے بروئے کار لانے میں جس پیش قدمی اور تحریک کی ضرورت تھی وہ مفقود تھی یہ غربت اور بے روزگاری کا آماج گاہ تھا ۔ یہاں انگریزی کلاسیکل اسکول کے معاشی نظریے ناقابل عمل تھے بلکہ ترقی کی راہ میں حارج ۔ لسٹ نے اپنے ملک کے ان حالات کا گہرا اثر قبول کیا اور انگریزی نظریات کی ہمہ گیری کے خلاف آواز بلند کی ۔ ادھر بحر اوقیانوس کے پار امریکہ کی نئی ابھرتی ہوئی جمہوریت تھی ، جہاں ہملٹن کے نظریات کے تحت ایک موثر قومی معاشی پالیسی ملک کی معیشت کی ترقی کے لیے استعمال کی جا رہی تھی ۔ ریلوں کا اجرا ہو چکا تھا اور ان کے اثر سے وہ زبردست ہلچل پیدا ہو چکی تھی جو قومی معیشت کی ترقی کی ضمانت ہے ۔ لسٹ کی کتاب میں ان اثرات کی کارفرمائی صاف نظر آتی ہے ۔ اس کتاب نے بعد کو ترقی کرنے والی قوموں کے تفکر پر گہرا اثر ڈالا ۔ چنانچہ براعظم امریکہ کی ایک اور ریاست کناڈا نے ۱۸۶۹ء میں جب معاشی ترقی کی طرح ڈالی تو وہاں کے دانشوروں اور حکمراں طبقہ نے وہی پالیسی اختیار کی جسے

لسٹ نے واضح کیا تھا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد ایشیا اور افریقہ کی نئی آزاد قوموں نے جب منصوبہ بندی کا اصول اپنایا، تو یہ لسٹ کی معاشی قومی ترقی کا بازگشت تھا۔ اس طرح ہم لسٹ کو منصوبہ بندی کا بابا آدم کہہ سکتے ہیں۔ جرمنی میں لسٹ نے چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے درمیان تجارت کے فروغ کے لیے اندرونی محصولوں کے ختم ہونے پر زور دیا۔ لسٹ کی شہرہ آفاق کتاب کا خاکہ مختصر طور پر ان الفاظ میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

لسٹ سب سے پہلے "بین القومی" اور "قومی" معیشت کے فرق کو واضح کرتا ہے۔ بین القومی اسکول کے موید اس غلط فہمی کا شکار نظر آتے ہیں کہ وہ قوموں کی ماہیت اور ان کے مخصوص حالات اور مفادات کو نظرانداز کر دیتے ہیں، وہ اپنی قومی ترقی کو دوسری قوموں پر منطبق کر دیتے ہیں اور اس طرح اپنی قومی ترقی کو دوسری قوموں کی ترقی کے لیے مقصد قرار دے دیتے ہیں۔ آزاد تجارت کا نظریہ ایک ترقی یافتہ صنعتی قوم کا نظریہ ہے جس سے نسبتاً کم ترقی یافتہ قوموں سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ یہ ترقی یافتہ قوموں کو غیر ترقی یافتہ قوموں پر حاوی کر دیتا ہے۔ "صنعتوں کے بچاؤ" کا نظریہ ایسا نظریہ ہے جو کم ترقی یافتہ قوموں کو ترقی یافتہ قوموں کے دوش بدوش لا کھڑا کر سکتا ہے۔

لسٹ نے کلاسیکل اسکول کی اساس یعنی "اقدار کے نظریہ" کے مقابل میں "نظریۂ قوائے دولت آفریں" پیش کیا، جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ دولت کا سرچشمہ پیداوار میں ہے پیداوار قوتوں میں اضافہ تعلیم، انصاف اور قوم کی حفاظت پر زر صرف کرنے سے ہوتا ہے۔ ان ہی سے مادی اور غیر مادی دولت پیدا ہوتی ہے اور ان ہی سے صنعتی اور معاشی ترقی ہوتی ہے۔ صنعتی طاقت زرعی طاقت سے برتر ہے۔ اس لیے کہ وہ قوم کے اندر وہ صفات پیدا کر دیتی ہے جو اسے ترقی کی طرف لے جاتی ہیں ان پیداواری قوتوں کے بڑھنے کے لیے اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ ان کو مخالف طاقتوں سے بچایا جائے۔ یہ حفاظت بچاؤ محصول لگانے سے حاصل ہوتی ہے۔ اس طرح صنعتوں کی ترقی ہوتی ہے اور ان سے پیداواری قوتوں میں اضافہ ہوتے رہتے ہیں۔

لسٹ کے معاشی تفکر کی نمایاں صفات مندرجہ ذیل شقوں کے تحت معرض بحث میں لائی جا سکتی ہیں۔ حکومت کی مداخلت اور انگریزی کلاسیکل اسکول کے نظریات کے مقابلہ نظریۂ ضافیت صنعتوں کے بچاؤ کی پالیسی اور متوازن ترقی، جرمن ریاستوں کی انجمن

کلاسیکل اسکول کے نظریات کی ہمہ گیری کے بارے میں ہم اوپر تذکرہ کر چکے ہیں۔ یہاں یہ کہہ دینا کافی ہے کہ انگریزی کلاسیکل معاشیین نے کاروبار دے ہل "تک آزاد تجارت اور ریاست کے معاشی

معاملات میں عدم مداخلت کے قائل تھے۔ ان کے نظریات انگلستان کے مخصوص معاشی ترقی کے تجربہ پر مبنی تھے جنھیں وہ آفاقی سمجھتے تھے۔ خود انگلستان نے جو صنعتی ترقی کی تھی وہ بڑی حد تک حکومت کی مداخلت کی وجہ سے تھی۔ سولہویں اور سترھویں صدی میں جب جدید معاشی نظام اپنی ابتدائی حالت میں تھا، حکومت نے اُسے "تجارتی نظام" کے زیر اثر ہر قسم کی مدد پہنچائی تھی۔ جو صنعتوں کے بچاؤ سے لے کر جہازرانی کو ترقی دینے تک پر محیط تھی۔ صنعتی انقلاب رونما ہونے کے بعد انیسویں صدی کے وسط سے معیشت اتنی ترقی یافتہ ہو گئی تھی کہ خود ریاست کو ترقی کی راہ دکھائے۔ یہ دور آزاد تجارت کا دور ہے۔ چنانچہ صنعتی ترقی کے اس دور میں برطانوی صنعت کاروں کے لیے اس میں فائدہ تھا کہ ان کی مصنوعات بغیر کسی روک ٹوک کے دنیا کے سارے ممالک میں درآمد کی جائیں تاکہ ملک کے اندر بے روزگاری میں کمی اور خوشحالی میں اضافہ ہو۔ یہ اصول ان غیر ترقی یافتہ اور غیر صنعتی ملکوں کے مفاد کے خلاف تھا جو اپنی معیشت کی ترقی بچاؤ کی پالیسی کے تحت ہی کر سکتے تھے۔ لسٹ کا یہ طنز یہ جملہ ملاحظہ ہو "تاریخ کی یہ نہایت شاطرانہ چال ہے کہ جب ایک قوم ترقی کی چوٹی پر پہنچ جائے تو وہ اس بات کی کوشش کرے کہ اس سیڑھی کو ہٹا دے جس کے ذریعہ سے وہ اوپر چڑھی تھی تاکہ دوسرے لوگ اس کا پیچھا نہ کر سکیں۔"

چنانچہ حکومت کی مداخلت کی پالیسی غیر ترقی یافتہ قوموں کے حق میں تھی، بلکہ ان کے لیے ضروری تھی تاکہ وہ حکومت کی مدد سے اپنی قوت پیداوار میں اضافہ کریں اور ایسے ماحول کی تشکیل کریں جو صنعتی ترقی کے لیے معاون ہو۔ ریاست صنعت کار طبقہ کی عدم موجودگی میں ایسے ادارے قائم کرے جن کے ذریعہ اس طبقہ کو فروغ ہو سکے۔ یہاں حکومت کو ایک انقلابی عنصر کی حیثیت سے لسٹ نے متصور کیا ہے یہ نظریہ حیرت انگیز طور پر موجودہ پس ماندہ ممالک پر منطبق ہوتا ہے۔ جنھوں نے منصوبہ بندی کے ذریعہ وہی کرنے کی کوشش کی ہے جس کا نقشہ لسٹ نے اپنی کتاب میں انیسویں صدی کے شروع میں پیش کیا تھا۔

اسی کے ذیل میں صنعتوں کی متوازن ترقی کا نظریہ آتا ہے۔ لسٹ کا خیال تھا کہ زراعت اور صنعتیں ایک معیشت کے دو جز ہیں، جو باہم مل کر ایک کل بنتے ہیں۔ دونوں کی برابر کی ترقی سے معیشت کی ترقی ہوتی ہے۔ صرف زراعت کی ترقی سے وہ صفات جو قومی معیشت کو آگے بڑھاتی ہیں، بیروزگاری کو کم کرتی ہیں، قومی آمدنی میں اضافہ کرتی ہیں، حاصل نہیں ہو سکتیں۔ صنعتی ترقی خود زراعت کی ترقی کی راہیں کھولتی ہے۔ یہ نظریہ آج کل منصوبہ بند ممالک میں عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے اور خود معاشی نظریات میں ایک مسلمہ اصول مانا جاتا ہے۔ لسٹ نے اس کی طرف توجہ دلا کر غیر ترقی یافتہ ممالک کے لیے ایک اہم معاشی اصول کی وضاحت کی ہے۔

ایک اور چیز جسے لسٹ کے خلاق ذہن نے پہلے محسوس کیا وہ اندرونی درآمدی محصولوں کو ختم کرنے کے لیے ایک انجمن کا قیام تھا، دوسری جنگ عظیم کے بعد یورپ کے بہت سے ملکوں نے باہمی تجارت پر محصول ختم کر دیے ہیں اور مصنوعات کی کھپت کے لیے محفوظ بازار قائم کر لیے ہیں۔ لسٹ کے زمانہ میں جرمنی بہت سی چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں منقسم تھا۔ ان میں آپس کی تجارت میں بڑی رکاوٹ پیدا ہوتی تھی اور صنعتی ترقی کی راہ مسدود ہوگئی تھی۔ لسٹ نے اپنی کوششوں سے چند ریاستوں پر مشتمل ایک انجمن کے قیام کی طرف توجہ دلائی۔ یہ ZALLVEREIN تھی۔ چنانچہ بسمارک کی قیادت میں جب زبردست جرمن صنعتی ترقی کا آغاز ہوا تو اس کی تحریک لسٹ کی انجمن سے ہوئی۔ ہمارے زمانہ میں یورپین کامن مارکیٹ اور اب ایشیائی کامن مارکیٹ (جس کی صدا اب بلند ہونے لگی ہے) اسی اصول کی کارفرمائی ظاہر کرتے ہیں۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ لسٹ کا زور اس بات پہ ہے کہ کسی قوم کی معیشت کی ترقی کے لیے کسی دوسرے ملک کے اصول بعینہٖ منطبق نہیں کیے جاسکتے۔ اس لیے کہ ہر ملک کے تاریخی، معاشی، سماجی اور سیاسی ادارے اس ملک سے مخصوص ہوتے ہیں۔ ان اداروں کو نئے اصولوں کے تحت نئے قالب میں ڈھالنا دراصل ریاست کے فرائض میں سے ہے۔ چنانچہ قومی ترقی ہی کے ذریعہ بین القومی ترقی ہوسکتی ہے یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ اگر دنیا کے سب ملک صنعتی ترقی یافتہ ہوجائیں تو صنعتی ممالک کی مصنوعات کی مانگ کم ہوجائے گی، اور برآمد کرنے والے ممالک کی معیشت بہت متاثر ہوگی۔ لسٹ کا خیال تھا کہ پس ماندہ ممالک کی معیشت کی ترقی، ترقی یافتہ ممالک کی مصنوعات کی مانگ کو بڑھا دے گی۔ ہاں وہ عام صرف میں آنے والی اشیا اور روایتی اشیا نہیں ہوں گی بلکہ مشینی مصنوعات ہوں گی۔ یہ بات تجربہ نے ثابت کر دی ہے، اور اس کا اثر ہم آج کے ترقی کرتے ہوئے ایشیائی اور افریقی ممالک کی معیشت میں دیکھ رہے ہیں۔

(۳)

ان کی تصنیفات میں معاشیات: مقصد اور منہاج" اور "سرمایہ داری" ہیں۔ اول الذکر ان خطبات پر مشتمل ہے جو ہندستانی اکیڈمی کے سامنے پڑھے گئے، اور بعد کو وہیں سے کتابی شکل میں شائع ہوئے۔ اس کا دوسرا اڈیشن (۱۹۴۱ء) ہمارے پیش نظر ہے۔ دوسری کتاب ان خطبات پر مشتمل ہے جو دھلی یونیورسٹی میں ۱۹۴۴ء میں دیے گئے اور ۱۹۴۸ء میں وہیں سے چھپے۔ اوپر اس کا تذکرہ ہوچکا ہے کہ ہم کہاں تک ان کتابوں کو ذاکر حسین کا طبعی کارنامہ کہہ سکتے ہیں۔ جیسا کہ درج کیا جاچکا ہے دونوں کتابوں میں اس بات کا اعادہ کیا گیا ہے کہ یہ کتابیں ان کے استاذ زومبارٹ کی تحقیقات اور تفکر سے ماخوذ ہیں۔ بلکہ

پہلی کتاب کا انتساب خود زومبارٹ کے نام کیا گیا ہے۔ یہاں ہم یہ فرض کرلیں گے کہ اپنے اسلوب کے لحاظ سے یہ دونوں کتابیں تصنیف کا درجہ دیے جانے کی مستحق قرار دی جاسکتی ہیں۔

" معاشیات مقصد اور منہاج" میں اُن مدرسہائے فکر کو پیش کیا گیا ہے جو معاشیات کا موضوع اور اس کے مقصد کا تعین کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس میں مصنف نے جرمن روایت کو اپناتے ہوئے فلسفیانہ نقطۂ نظر سے معاشیات کے مختلف مدرسوں کے تفکر کا آغاز، ان کی نشو ونما میں مدد کرنے والے عوامل، اور ہر مدرسہ کی خامیاں اور نمایاں صفات بڑی خوبصورتی اور چابکدستی سے واضح کی ہیں۔ ان میں جرمن مصنفوں کے دماغ کی کارفرمائی صاف نظر آتی ہے۔ موضوع سے متعلق ہر مفید مطلب بات کا اجتماع اُن پر محاکمہ اور ایک نتیجہ پر پہنچنا، اس نتیجہ کو اختیار کرنے کے اسباب اور اس کی فوقیت سب بہت اچھی طرح سے آگئی ہیں۔ انگریزی مصنفوں کے مقابلہ میں یہ کتاب ایک خوشگوار تبدیلی کا اثر چھوڑ جاتی ہے۔ انگریزی خلاق ذہن بہت حقیقت پسند ہے۔ وہ موافق اور مخالف نقطہ ہائے نظر کی بحث میں نہیں پڑتا، بلکہ جلد سے جلد منزل پہنچنا چاہتا ہے۔ ضمنی مباحث جو اصلی بحث پر براہ راست اثر انداز نہیں ہوتے یک قلم خارج کردیے جاتے ہیں۔ اس لیے مقصد اور منہاج درحقیقت انگریزی فضیلت کے زمرہ سے خارج ہیں۔

علم معاشیات کو سمجھنے کے لیے تین مدرسہائے فکر قرار دیے جاسکتے ہیں یعنی معاشیات معیاری، معاشیات ترتیبی اور معاشیات افہامی۔ ان میں سب کے بہت سے ذیلی مدرسے ہیں اور ان میں تھوڑا تھوڑا فرق بھی ہے۔ مگر بحیثیت مجموعی یہ اختلافات انہی تین مدرسوں کے تحت آجاتے ہیں۔ افہامی معاشیات کی فوقیت ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے۔" افہام کا یہ نظریۂ علم ان بنیادی افکار پر مبنی ہے کہ ہم جنس کا علم یعنی ہم جنس کا سمجھنا ہم جنس ہی کے لیے ممکن ہے۔ اور یہ کہ ہم پورے طور پر اور ہر پہلو سے اسی چیز کو جان سکتے ہیں جسے ہم خود بنا بھی سکیں۔ مثلاً ہر تمدن کے فہم کی کوشش میں چونکہ مدرک بھی ذہن اور مدرک بھی تشکیل ذہن، اس لیے دونوں ہم جنس ہیں اور اسی لیے پورا علم ممکن ہے۔ پھر سارا تمدن آدمی کا ساختہ پرداختہ ہے۔ اسی نے اسے بنایا ہے۔ اس لیے یہ اُسے سمجھ سکتا ہے۔"

موجودہ دور کے معاشیین کے نزدیک یہ ساری بحث منطقی ہے۔ ملکوں کی ترقی کے ساتھ زندگی پیچیدہ ہوگئی ہے اور معاشی سرگرمیوں میں ایک تنوع پیدا ہوگیا ہے۔ اس کے تحت معاشیات کے موضوع، مقصد اور منہاج کو اب صرف چند وسیع الفاظ کے ذریعہ برخاست کردیا جاتا ہے۔ جیسے" معاشیات اس فن کا نام ہے جو معاشیین کے عمل سے ظاہر ہو" وغیرہ وغیرہ۔ اس کتاب کی تصنیف معاشی ادبیات میں ایک قابل قدر اضافہ ہے۔

ذاکر حسین کی دوسری تصنیف ہے "سرمایہ داری: ایک مضمون تفہیم میں"۔ یہ ان خطبات پر مشتمل ہے جو دہلی یونیورسٹی میں دیے گئے۔ اس کتاب پر ہم قدرے تفصیل سے اظہار خیال کریں گے۔ سب سے پہلے اس مضمون کا خاکہ: معیشت کے تین جز ہیں، اس کی روح یا دماغ، اس کی تنظیم یا شکل اور اس کی تکنیک۔ اس کی روح کی ترجمانی جن صفات سے ہوتی ہے وہ تحصیل کی خواہش، انفرادیت اور استدلالیت ہیں۔ اس کی شکل آزادی، شخصی معیشت سے مترشح ہوتی ہے اور اس کی تکنیک سائنسی، انقلابی اور استدلالی ہے۔ ان صفات کو عملی جامہ پہنانے والا صنعت کار ہے۔ یہ دو مختلف صفات کا حامل ہے یعنی جدت طرازی اور مدنی صفات۔ اس معیشت کی ترقی اس وقت سے شروع ہوئی جب سرمائے کے حاصل کرنے کی خواہش نے کاروبار کے قائم ہونے کا عملی جامہ پہنا۔ یہ کاروبار مختلف قسم کے تھے، یعنی فوجی تاکہ ملکوں کی تسخیر کا کام انجام دیا جائے۔ کلیسا اور ریاست کے مفادات کو تقویت پہنچانے والے کاروبار۔ اور جاگیر کے زیر مقبوضہ علاقوں میں پیشوں، ہنروں اور دستکاریوں کی ترقی۔ اس کی ترقی نے سب سے بڑا قدم اس وقت اٹھایا جب اضافۂ زر کی خواہش نے صنعتوں کے قائم کرنے کی شکل اختیار کی۔ سرمایہ داری نظام کی ترقی میں دو ادوار آسانی کے ساتھ کیے جاسکتے ہیں۔ سب سے پہلا سولہویں اور سترہویں صدی میں جبکہ معاشی اصول "تجارتی نظام" کے نظریات میں ظاہر ہوئے اور دوسرا انیسویں صدی کے شروع میں جب "نئے تجارتی نظام" کے نظریات پیش کیے گئے۔ پہلے دور میں ریاست نے معاشی نظام کی رہبری کی۔ دوسرے دور میں معاشی نظام نے ریاست کی۔ چنانچہ ریاست کی مداخلت اور عدم مداخلت، اور اس کے اثرات سے پیدا ہونے والے نظریات دونوں ادوار کو ایک دوسرے سے ممتاز کرتے ہیں۔

اس نظام نے زری معیشت کو پروان چڑھایا اور معاشی ترقی، زر کے بڑھتے ہوئے استعمال اور اس میں روز افزوں اضافے مطمع نظر بن گئے۔ سرمایہ کار نے سرمایہ اور محنت کو پیداوار کے اضافے کے لیے ایک جگہ جمع کیا۔ سرمایہ دراصل اقدار مبادلہ کی مقدار کا نام ہے جو پیداواری نظام میں مختلف شکلوں میں رونما ہوتا ہے، یعنی مشینیں، خام اشیا، صنعتی اور فنی مہارت وغیرہ۔ محنت مزدور طبقہ سے حاصل کی جاتی ہے۔ اس لیے سرمایہ داری نظام کے لیے یہ ضروری ہوا کہ پہلے ایک مزدور طبقہ وجود میں آئے جو علاوہ سرمایہ دار کے کاروبار کے کہیں اور روزگار نہ حاصل کرسکے۔ یہ طبقہ مختلف واقعات اور حادثات کی وجہ سے ظہور پذیر ہوا اور ایک لمبے عمل سے اس کی ابتدا ہوئی جو "حدبندی کی تحریک" سے شروع ہوتا ہے۔ اس نظام نے بحران اور ترقی دونوں کا سامنا کیا، اور اس عمل کو ایک ایسی شکل دی جس سے بحیثیت مجموعی اس کو فائدہ ہی پہنچا۔ اس کے مستقبل کے بارے میں کوئی قطعی حکم نہیں لگایا جاسکتا۔ اس کی شکل زمان ومکان کی

تبدیلی کے ساتھ بدلے گی لیکن یہ نظام اس طرح سے اپنا دم نہیں توڑے گا کہ وہ یکا یک ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے
یہ البتہ ممکن ہے کہ یہ نظام اپنے بطن سے کسی دوسرے نظام کو جنم دے اور بالآخر اس میں ضم ہو جائے۔

یہاں سرمایہ داری نظام کو ان صفات سے مخصوص کیا گیا ہے جو اس کی روح اور دماغ سے تعبیر کی گئی ہیں یہ نظریہ زومبارٹ سے منسوب ہے۔ اس پر یہ اعتراضات کیے گئے ہیں کہ یہ نظریہ اس بات کو واضح نہیں کرتا کہ سرمایہ دارانہ روح اور دماغ خود کس چیز کی پیداوار ہیں، ان کو وجود میں لانے والے کون سے حالات ہیں اور کن اداروں نے اسے پروان چڑھایا ہے۔ اس کے علاوہ سرمایہ دارانہ نظام کو کسی ایک دور سے مخصوص نہیں کیا گیا ہے۔ تاریخ کے شروع سے ہر سماج میں اس نظریہ کے مطابق بعض سرمایہ دارانہ صفات مل جائیں گی جو ہم آج صرف جدید دور سے منسوب کرتے ہیں۔ اس نظریہ پر سب سے کڑی تنقید مارکسی مفکر کرتے ہیں جو مارکس کے نظریۂ سرمایہ داری کو سائنسی اور مکمل قرار دیتے ہیں۔
مارکس کا نظریۂ سرمایہ داری یہ ہے کہ یہ نظام ایک مخصوص "طریقۂ پیداوار" میں ہی ظاہر ہوتا ہے، جہاں کہ ذرائع پیداوار ایک مخصوص طریقہ سے ملکیت ہوتے ہیں، اور جہاں انسانوں کے درمیان سماجی تعلقات اسی رشتۂ ملکیت کے ذرائع پیداوار سے مرتب ہوتے ہیں۔ اس نظریہ کے تحت سرمایہ داری محض ایک عام نظام پیداوار اشیا ہی نہیں ہے بلکہ وہ نظام ہے جہاں کہ بذات خود ایک شے بن گئی ہے جو دوسری اشیا کی طرح بیچی اور خریدی جاتی ہے۔ اس کی ابتدا ایک طبقہ کے ذریعہ پیداوار کے مالک ہونے، اور دوسرے کے اس کی ملک ہونے سے ہوتی ہے۔

نظام سرمایہ داری کے آغاز اور اس کی نشو و نما میں ممد عوامل کا تجزیہ کچھ عرصہ پہلے معاشئین میں خاص سرگرمی کا باعث تھا۔ لیکن حال میں یہ بحث بڑی منطقی ہو گئی ہے اس لیے کہ معاصر سرمایہ دارانہ نظام بہت حد تک مخلوط ہو چکا ہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ انگلستان میں قومی آمدنی کا بیس فی صدی حصہ قومی صنعتوں سے حاصل ہوتا ہے۔ امریکہ میں قومی کنٹرول روز بروز بڑھ رہا ہے۔ آج حکومت زر اور ٹیکس لگانے والی طاقت سے کام لے کر پوری معیشت پر غلبہ حاصل کرتی ہے۔ اور اگرچہ افراد کو صنعتیں قائم کرنے اور انھیں فروغ دینے میں بڑی مدد پہنچاتی ہے۔ لیکن جب صنعتیں "بیمار" ہو جاتی ہیں تو حکومت کی سرپرستی کی آواز بلند ہوتی ہوئی سنائی دیتی ہے۔ دوسری طرف انقلاب روس کے بعد منصوبہ بندی نے فروغ پایا، اور نئے آزاد ممالک میں اس کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ ترقی یافتہ ممالک میں غربت اور بے روزگاری اب صرف یاد کے طور پر باقی رہ گئی ہے جس سے کہ کبھی ملک کسی ابتدائی حالت میں دوچار ہوا تھا۔ معاشئین

اب یہ صدا بلند کرنے لگے ہیں کہ معاشی نظریات اور معاشی اوزار دوبارہ سے ڈھالنے چاہئیں۔ اس لیے کہ یہ نظریات اب "عام صَرف سماج" کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتے۔ معشیت پہلے خواہشات کو پورا کرنے کے ذرائع محدود رکھتی تھی۔ اب قوتِ پیداوار میں اضافے کے سبب لامحدود ہوگئے ہیں۔ انسان کی تمام تر خواہشات پوری ہونے کے مواقع میسر آگئے ہیں۔ اس لیے معاشیات کا موضوع "کمی" کے بجائے "افراط" ہوگیا ہے۔ اس مسئلہ کی وضاحت گالبرتھ نے اپنی مشہور کتاب "ایک متمول سماج" ہی کی ہے۔ لوگ آج متمول، صحت مند اور مطمئن زندگی کے متلاشی ہیں۔ یہ انھیں معاشی نظام دے دیتا ہے۔ وہ اب کسی ایسی بحث میں نہیں پڑنا چاہتے جو تاریخی ہو اور جس کے نتائج ان پر اثر انداز نہ ہوسکیں۔

اشارات

لے "ہندوستانی دانشوروں میں سے ایک شخص بھی ایسا نہیں ہے جس سے میں ملی ہوں اور اس نے مجھ سے یہ سوال نہیں کیا ہے: "تمھارا ذاکر حسین کے بارے میں کیا خیال ہے" جس کا مطلب یہ ہے کہ ڈاکٹر ذاکر حسین اپنے ہم وطنوں کے لیے ایک معمہ ہیں" ... خالدہ ادیب خانم "ہندستان کے اندر" میں۔

ٹے ملاحظہ ہو: "مصور جب کم سے کم خطوط سے اپنے مافی الضمیر کو کاغذ پا کپڑے پر ادا کرنا چاہتا ہے اور "اسراف خطوط" کے الزام سے بچنا چاہتا ہے تو اس اصول اقتصاد ہی پر تو عمل کرتا ہے۔ پختہ مشق غزل گو شاعر جب دو مصرعوں میں کیفیات ومعانی کے خزانے بند کر دیتا ہے، یا ایک بلیغ ادیب چند لفظوں یا جملوں سے ایک دفتر کا کام لے لیتا ہے۔ یا کوئی پرکار معشوق صرف ایک نگاہ غلط انداز سے طویل سے طویل معذرت یا عتاب نامہ کا کام نکال لیتا ہے، تو یہ سب اصول اقتصاد ہی پر تو عمل پیرا ہوتے ہیں اور یہی خاص خاص لوگ نہیں بلکہ ہر لمبی سڑک کو چھوڑ کر چھوٹی پگڈنڈی پر چلنے والا اپنی انگلی سے عمامہ، اوڑھنی اور جانماز کا کام لے لینے والا ہر طالب علم، نماز میں صرف قل ہو اللہ اور انا اعطینا سے کام لینے والا ہر نمازی نہیں صبح سے شام تک ہر سمجھ بوجھ والا آدمی اس اصول اقتصاد پر کاربند ہوتا ہے۔ پھر کیا غریب معاشی کے سپرد یہ کام ہے کہ ایک علم مدون کرے جو ان سب مختلف قسم کے اعمال پر حاوی ہو؟ اور خدا کا بڑا شکر ہے کہ کسی بزرگ نے یہ ناممکن کام اپنے ذمہ لیا بھی نہیں"

(معاشیات مقصد اور منہاج صفحہ ۱۲)



دائیں سے بائیں کرسیوں پر: محمد امین - پروفیسر اے ایف رحمن - جے تج ناول - ذاکر حسین خاں - محمد عبدالسمیع
دائیں سے بائیں کھڑے ہوئے: (؟) نفیس الحسن - عبدالباسط - ایس نوراللہ - اعجاز حسین - صوفی احمد بخش - فضل رزاق - نواب علی خاں - ایس مجید الدین

محی الدین احمد

ڈاکٹر ذاکر حسین۔ قومیت کے ایک حسین پیکر

ہندوستان ایک وسیع ملک ہے جہاں مختلف نسل اور فرقے، عقیدے اور مذہب، ذات اور زبانوں کے بولنے والے لوگ رہتے اور بستے ہیں اس لیے اگر اسے مجموعۂ اختلاف کا مسکن کہا جائے تو غالباً غلط نہیں۔ چنانچہ ان مختلف ذات، فرقے، نسل، عقیدے اور مذہب کے لوگوں کے اختلافات کو کم کرنے اور انھیں ایک مشترک، مرکز عمل پر لانے کی سعی و عمل ہمارے اکابرین نے مختلف طریقہ سے کی ہیں۔ بعضوں نے احیاء پرستی کے طریقوں کو اپنایا اور رجعت پسند کہلائے۔ کچھ لوگوں نے توڑ پھوڑ کے اصولوں پر جان دی اور انقلابی کہلائے۔ چند اشخاص نے ان دونوں طریقوں کے درمیان کا راستہ اختیار کیا اور معتوب ٹھہرائے گئے۔ تیسری جماعت کے افراد نے پہلی دو انتہا پسند جماعتوں کے اشتداد کو کم کرنے اور لوگوں کو ایک نقطۂ اعتدال پر لانے کی سعی کی۔ ان میں بعض مخلص تھے اور بعض غیر مخلص۔ جو لوگ مخلص تھے ان میں یکساں طور پر اخلاص نہ تھا بلکہ ان میں اس کی کمی و زیادتی تھی جس کا اندازہ لگانا کچھ زیادہ مشکل نہ تھا۔ انھوں نے انسانیت کا جو تخیل و تصور قائم کیا تھا اور فلاح انسانیت کے لیے جس طرز عمل کو اپنایا تھا اسے ان کے اخلاص کا میزان و معیار قرار دیا جاسکتا ہے۔ کسی شخصیت کے متعلق تاریخ بھی اسی میزان و معیار پر اپنی مہر ثبت کرتی ہے۔ ذاکر صاحب نے اپنے تصورات و عمل کے جو گہرے نقوش ہمارے ذہنوں پر چھوڑے ہیں ان کا ایک سرسری جائزہ خود ان کی تحریر و تقریر کی روشنی میں اگر پیش کر دیا جائے تو ان کی شخصیت کی ہمہ گیری و اہمیت کو جانچنے اور پرکھنے میں آسانی ہوگی۔

انسانی زندگی میں فرد و جماعت سے متعلق ذاکر صاحب کا جو عقیدہ تھا اسے "مقدمہ ریاست" میں بڑے ہی خوبصورت انداز میں پیش کیا گیا ہے "ذہنی زندگی کا خاصہ ہے کہ وہ اجتماع میں کم از کم دوئی سے پیدا ہوتی ہے حیات انفرادی کا پودا جماعت کی نمو بخش فضا ہی میں پرورش پاتا ہے۔ من و تو یکساں طور پر ذہنی زندگی کے لوازم ہیں۔" مگر جس ملک کے وہ باسی تھے اس کے متعلق ان کا عقیدہ اور رویہ کیا تھا وہ ان ہی کے الفاظ میں سنیے۔

"اس ماحول سے نکل کر جس ملک میں تم جا رہے ہو وہ بڑا ہی بدنصیب ملک ہے، ظالمانہ رسموں کا ملک ہے، غافل پجاریوں کا ملک ہے، سستی اور غفلت برتنے والوں کا ملک ہے، بیماریوں کا ملک ہے، افلاس و ناداری کا ملک ہے، ان سب سے بڑھ کر یہ کہ بھائی بھائی میں نفرت کا ملک ہے، غرض بڑا کم بخت ملک ہے۔ اسی میں جینا ہے اسی میں مرنا ہے۔ اس لیے یہ ملک ہماری اور تمھاری ہمتوں کے امتحان، ہماری اور تمھاری قوتوں کے استعمال اور ہماری اور تمھاری محبت کی آزمائش کی جگہ ہے۔"

"آج ملک میں باہمی نفرت کی جو آگ بھڑک رہی ہے اس میں ہمارا چمن بندی کا کام دیوانہ پن معلوم ہوتا ہے۔ یہ آگ شرافت اور انسانیت کی سرزمین کو جھلسے دیتی ہے اس میں نیک اور متوازن شخصیتوں کے تازہ پھول کیسے پیدا ہوں گے۔ بربریت کے دور دورے میں تہذیب کو کیسے بچا سکیں گے؟ یہ مسئلہ صرف ملک و قوم کے زندہ رہنے کا ہے بلکہ مہذب انسانی زندگی اور وحشیانہ زندگی میں انتخاب کا ہے۔"

خلاصہ یہ کہ انھوں نے اپنے لیے مہذب انسانی زندگی کا انتخاب کیا تھا چنانچہ وہ اپنی تمام تر کوششیں اسی پر صرف کیا کرتے تھے اور لوگوں میں ہمیشہ اسی کی تلقین بھی کیا کرتے تھے۔ اس سلسلہ میں وہ اپنی شکست تسلیم کرنے کے لیے ہمیشہ تیار رہتے اگر ان کی شکست میں تہذیب کی فتح ہوتی۔

تہذیب و تمدن سے متعلق ان کا جو تخیل اور طریقہ کار تھا وہ ان کے خطبے میں پڑھیے:" ہمارے ماہرین تعلیم اگر نیک نیتی سے ہندوستان کی تعلیم کا نظام بنائیں تو مجھے یقین ہے کہ وہ مسلمانوں کی اس خواہش کو خوشی سے قبول کر لیں گے کہ وہ اپنی تعلیم کی بنیاد اپنے تمدن پر رکھیں کہ صحیح تعلیم اور صحیح سیاست دونوں کا یہی تقاضا ہے اگر اس معزز مجمع کے سامنے میں صفائی سے یہ بات پیش کر دوں کہ مسلمانوں کو جو چیز متحدہ ہندوستانی قومیت سے بار بار الگ کھینچتی ہے اس میں جہاں شخصی خود غرضیاں، تنگ نظری اور دیس کے مستقبل کا صحیح تصور نہ قائم کر سکنے کو دخل ہے وہاں اس شدید شبہ کا بھی بڑا حصہ ہے کہ قومی حکومت کے ماتحت مسلمانوں کی تمدنی ہستی کے فنا ہونے کا ڈر ہے اور مسلمان کسی حال میں یہ قیمت ادا کرنے پر راضی نہیں اور میں بحیثیت مسلمان ہی نہیں سچے ہندوستانی کی حیثیت سے بھی اس پر خوش ہوں کہ مسلمان اس قیمت کے ادا کرنے پر تیار نہیں۔ اس لیے کہ اس سے مسلمانوں کو جو نقصان ہوگا سو ہوگا ہی خود ہندوستان کا تمدن پستی میں کہاں سے کہاں پہنچ جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ سچے ہندوستانی مسلمان اپنی مذہبی روایات، اپنی مذہبی تاریخ، اپنی تمدنی خدمات اور اپنے تمدن سے توقعات کی وجہ سے اپنے ملی وجود کو خود اپنے لیے ہی بے بہا نہیں سمجھتے بلکہ ہندوستانی قومیت کے لیے بھی نہایت بیش قیمت جانتے ہیں۔

ہندوستانی مسلمانوں[۱۵] کو اپنا دیس کسی اور سے کم عزیز نہیں ہے وہ ہندوستانی قوم کا جزو ہونے پر

---

۱۵ اس میں شک نہیں کہ ذاکر صاحب کے ذہن میں ایک مخصوص قوم کا تصور تھا مگر اس تخصیص میں تعمیم کا پہلو بھی نمایاں ہے۔

فخر کرتے ہیں مگر وہ ایسا جزو بنا کبھی گوارا نہ کریں گے جس میں ان کی اپنی حیثیت بالکل مٹ چکی ہو"

قومی تہذیب کا جو تصور انھوں نے قائم کیا تھا کہ اگر اس کے متعلق یہ کہا جائے کہ وہ اس کے حسین پیکر تھے تو غالباً غلط نہ ہوگا۔ انھوں نے اپنی زندگی میں جن اصولوں کو اپنایا اور اس پر پوری زندگی کاربند رہے وہ تھا "سعی و عمل کے ذریعے حصول علم کا عقیدہ" جو صحیح معنی میں تمدنی اقدار کی خالق ہے۔ سعی و عمل سے ان کی مراد محض دماغی و ذہنی کد و کاوش نہیں بلکہ قلبی و روحانی طہارت و پاکیزگی بھی تھی۔ ان دماغی و ذہنی کاوشوں کے عناصر انھوں نے مغربی ماہرین تعلیم سے اور قلبی و روحانی طہارت کے اجزا خصوصاً صوفیائے کرام اور عموماً گاندھی جی سے حاصل کیے تھے۔ ان کے نزدیک قوموں کی زندہ و متحرک دماغی و روحانی اقدار کا نئی نسلوں میں نفوذ تعلیم و تربیت کا مقصد عظیم اور انسانی زندگی کا جزو لازم تھا چنانچہ اس بیان کا ایمان تھا کہ قوموں کے مختلف تمدنی مظاہر مذہب، اخلاق، سائنس اور ادب میں ان اقدار کا ظہور بہر حال ہوتا ہے اس لیے معلمین کو اول خود اس کا احساس ہونا ضروری ہے کیونکہ اس احساس کی افزائش کے بغیر ممکن نہیں کہ وہ اپنے طلبا میں ان کا ادب و احترام پیدا کر سکیں چنانچہ ان محترم اقدار کے حصول کا اگر کوئی مفید و موثر ذریعہ ہے تو وہ عمل اور صرف عمل ہے اس طرح مذہب کا اتقان عبادت سے، اخلاق کا خوش خلقی سے سائنس کا تجربے سے اور ادب کا فنی ریاضت سے ہی ممکن ہے۔

ذاکر صاحب نے عمل و علم کے انھیں اصولوں کو اپنایا تھا اور جامعہ ملیہ کو "مکتب عمل" کا ایک نمونہ بنا کر لوگوں کے درمیان پیش کیا تھا جہاں درس سبق سے زیادہ درس عمل کی تلقین کی جاتی ہے۔ ذاکر صاحب کے نزدیک با اصول و با مقصد عمل محض مفید و موثر ذریعہ تعلیم و تعلم نہیں بلکہ واقعتاً اس سے کہیں کچھ زیادہ ہے۔ انسان کو صحیح معنی میں فرحت و انبساط اگر حاصل ہوتے ہیں تو وہ با مقصد عمل ہی سے حاصل ہوتے ہیں۔ چنانچہ سوسائٹی کے ایک ذمہ دار فرد ہونے کی حیثیت سے انھوں نے اس کے ذریعہ نہ صرف اپنی تمناؤں کی تکمیل اور اپنے لیے نجات کا راستہ ڈھونڈ نکالا تھا بلکہ تمام انسانوں کو معراج انسانیت تک پہنچانے کا ایک وسیلہ سمجھا تھا۔ یہ سو فی صدی صحیح ہے کہ "ان کے عمل کا میدان ہمیشہ بدلتا رہا مگر ان کی شخصیت جیسی تھی ویسی ہی رہی"

باقر مہدی

بچوں کی تعلیم و تربیت کے بارے میں
ذاکر صاحب کے کچھ خیالات

ذاکر صاحب کی ہمہ گیر شخصیت کا ایک بنیادی پہلو اُن کی تعلیم سے دلچسپی ہے۔ معلمی کا پیشہ ان کے نزدیک شریف ترین فن ہے۔ ایک استاد کو وہ صحیح معنی میں قومی زندگی کا معمار سمجھتے ہیں۔ انھوں نے اپنی عمر کا ایک طویل حصہ درس و تدریس کے کاموں میں صرف کیا۔ اپنے علم کی بلندی اور وسعت کے باوجود جو انھیں یونیورسٹی پروفیسر کے ممتاز عہدہ پر فائز کر سکتے تھے انھوں نے ہمیشہ بچوں کا استاد رہنا پسند کیا۔ جامعہ جو ان کے تعلیمی خوابوں کی تعبیر تھی بچوں کی درس گاہ کی حیثیت سے شروع ہوئی۔ اس کا سنگ بنیاد بھی انھوں نے ایک بچہ سے رکھوایا اور بے لوث خدمت کا جذبہ رکھنے والے استادوں کی ایک جماعت کے ساتھ خود کو بچوں کی تعلیم و تربیت کے کام میں اس طرح منہمک کر دیا کہ جامعہ اور ذاکر صاحب دونوں کو پھر کبھی بھی ایک دوسرے سے جدا نہ کیا جا سکا۔ نہ زندگی میں اور نہ مرنے کے بعد۔ جامعہ اُن کے نزدیک اور مدرسوں کی طرح محض ایک مدرسہ نہیں تھا جہاں بچوں کو درجوں کی چہار دیواری میں گھیر کر کچھ مضامین پڑھا دیے جائیں بلکہ وہ اسے علم و عمل اور فکر و جذبہ کی ایسی تربیت گاہ بنانا چاہتے تھے جہاں نہ صرف آزاد ذہنوں کی تعمیر ہو سکے بلکہ جس میں ایسے دل بھی بنائے جائیں جو محبت، شرافت مروت اور اخلاص کی دولت سے مالا مال اور انسان دوستی اور ایثار و قربانی کے جذبے سے مملو ہوں جن میں صحیح بات کہنے اور کہہ کر اس پر قائم رہنے کا حوصلہ ہو، اور غلط بات پر اڑنے والوں اور غلط کام کو صحیح سمجھنے والوں سے ٹکر لینے کی جرأت ہو، جو کوہ و بیاباں میں تو سیل تند رو ہوں لیکن گلستانوں میں جن کی مثال جوئے نغمہ خواں کی ہو۔ ذاکر صاحب جامعہ کی ٹکسال میں ایسے شہری ڈھالنا چاہتے تھے جن میں سیرت کی بلندی کے ساتھ ساتھ ملک و قوم کی خدمت کا جذبہ بھی کارفرما ہو۔ جس وقت جامعہ کی عمارت کا سنگ بنیاد رکھا جا رہا تھا انھوں نے

اپنی تقریر میں ایک بہت ہی گہری بات کہی تھی جسے خواجہ غلام السیدین صاحب نے اپنے ایک مضمون "مردِ مومن" میں جو ان کی تصنیف "آندھی میں چراغ" میں شامل ہے۔ ان خوبصورت الفاظ میں بیان فرمایا ہے "بڑی بڑی شاندار عمارتوں کے بنانے میں ہمیشہ یہ اندیشہ رہتا ہے کہ کہیں تعلیم کی روح ان میں اسیر ہو کر نہ رہ جائے اور ساز و سامان کی فراوانی تعلیم گاہ کے نصب العین کو دبا کر فنا نہ کر دے۔ آپ کو معلوم ہے کہ جامعہ کو چھوٹی چھوٹی کچی عمارتوں اور جھونپڑیوں میں شروع کیا گیا تھا اور اس کے کارکنوں کی ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ اس مادی بے سر و سامانی کی حالت میں اس کی آزادی اور بلند نظری کو قائم رکھا جائے۔ اگر نئی عمارتوں کے بننے سے یہ اندیشہ ہو کہ جامعہ اپنے نصب العین پر قائم نہ رہ سکے گی تو میں دعا کروں گا کہ یہ عمارتیں تیار ہونے سے پہلے برباد ہو کر زمین میں مل جائیں۔" یہ الفاظ ایسے موقع پر اس شخص کی زبان سے ادا ہو سکتے ہیں جس کی نظر میں درسگاہوں کی شاندار عمارتوں اور اس کے ساز و سامان سے زیادہ اہم وہ تعلیمی روح ہے جس پر صحیح معنوں میں کسی درسگاہ کی عظمت کا انحصار ہے۔ ان کے خیال میں اس روح کو پھونکنے والے وہ استاد ہیں جو کسی درسگاہ میں کام کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ذاکر صاحب کی نظر میں استادوں کی بے پناہ عزت تھی وہ خود بھی ایک اعلیٰ درجہ کے استاد تھے اور دوسروں میں بھی وہ ان خوبیوں کو دیکھنا چاہتے تھے جو ان کی نگاہ میں ایک استاد کا طرۂ امتیاز ہیں۔ "اچھا استاد" کے عنوان پر انھوں نے اپنی ایک تقریر میں جو ۵ امئی ۱۹۳۶ء کو آل انڈیا ریڈیو دلی سے نشر کی گئی فرمایا۔

"سچے استاد کے لیے تو ضروری ہے کہ وہ دوسرے آدمیوں سے محبت رکھتا ہو۔ اس کے دل میں آدمیوں سے بہ حیثیت آدمی پیار ہو۔ آپ ان سچے معلموں۔ اچھے استادوں پر نظر ڈالیے تو ان میں بہت سے گہرے مذہبی لوگ نظر آئیں گے۔ حسن جمال کے دلدادہ آرٹسٹ بھی ان کی صف میں ملیں لیکن یہ صفتیں ان کی ذہنی بناوٹ میں بیل بوٹے ہیں۔ تانا بانا وہی خدمت کا شوق اور بنی نوع کی محبت ہے۔"

اسی ذیل میں وہ آگے فرماتے ہیں۔ بات کتنی سچی ہے اور اسلوب کتنا دلنشیں :-

"استاد کی کتاب زندگی کے سرورق پر علم نہیں لکھا ہوتا "محبت" کا عنوان ہوتا ہے۔ اُسے انسانوں سے محبت ہوتی ہے۔ سماج جن خوبیوں کا حامل ہے اُن سے محبت ہوتی ہے۔ اُن ننھی ننھی جانوں سے محبت ہوتی ہے جو آگے چل کر ان خوبیوں کی حامل بننے والی ہیں۔ ان میں جہاں تک اور جس اسلوب سے ان خوبیوں کی تکمیل کا سامان ہے یہ اس میں مدد دیتا ہے۔ اس کام میں اپنے دل کے لیے راحت اور اپنی روح کے لیے تسکین پاتا ہے۔"

ذاکر صاحب استاد کی ایک اور اہم خوبی یعنی اس میں بچہ رہنے کی صلاحیت پر بھی بہت زور دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ "جب تک استاد میں بچپن ہے وہ بچوں کے دل کے راز جانتا ہے اور ان کی زندگی میں برابر کا شریک ہوکر ان کو بلندی کی طرف لے جاسکتا ہے جس استاد میں یہ بچپن نہیں ہوتا وہ بچوں کے دل کی بولی نہیں سمجھتا۔ نہ انھیں اپنی سمجھا جاسکتا ہے۔"

استاد کی ان خوبیوں کے تذکرے کے بعد جب وہ استادی کے فن پر نظر ڈالتے ہیں تو ان کی نگاہ تعلیم و نفسیات کے اُن اصولوں اور عام قاعدوں سے کہیں پرے جاتی ہے جو عام طور پر ٹریننگ کالجوں میں استادوں کی تربیت کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ ان کے خیال میں وہی اچھا استاد بن سکتا ہے جس میں بچوں کی شخصیت کو سمجھنے کی قدرتی صلاحیت موجود ہو جس کی نگاہیں جسم کے کثیف پردوں کو چیر کر دل و دماغ کی گہرائی میں پیوست ہوسکیں جہاں سے ہر انسانی عمل کے سوتے پھوٹتے ہیں۔ ذاکر صاحب کے الفاظ میں "اچھے استاد میں وہ صفت ہونی چاہیے جو اچھے ڈراما لکھنے والے، اچھے ناول نگار، اچھے مورخ میں ہوتی ہے کہ وہ ایک چھوٹے سے واقعہ سے، ایک ذرا سی بات سے، ایک معمولی سی حرکت سے، چہرے کے رنگ سے، آنکھوں کے تیور سے۔ غرض اظہار کے معمولی طریقے سے پورے آدمی کی کیفیت کا پتہ لگا لیتے ہیں۔ نفسیات کے عام قاعدے یہاں کر دھوکا دیتے ہیں اور حجاب بن جاتے ہیں کوئی قدرتی وجدانی قوت ہوتی ہے جو ان ننھے ننھے دریچوں سے جھانک کر روح کی چھپی ہوئی کیفیت کو دیکھ لیتی اور سمجھ لیتی ہے۔ اچھے استاد کی یہ پہچان ہے کہ اس میں یہ وجدان ہو اور احساس کی تیزی۔"

استاد کا کام ذاکر صاحب کے نزدیک مصلحوں اور پیغمبروں کے کام سے کہیں زیادہ کٹھن ہے۔ مصلحوں اور پیغمبروں کو بنی بنائی شخصیتوں سے واسطہ ہوتا ہے جنھیں وہ اپنی شخصیت اور کردار کے اثر سے جس طرف چاہتے ہیں موڑ دیتے ہیں۔ لیکن ایک استاد کا سروکار ان شخصیتوں سے ہوتا ہے جو ابھی بن رہی ہیں لہذا اُسے "اپنے شاگرد کی بننے والی شخصیت کا رُخ سمجھنا اور اس کے امکانات ترقی کا اندازہ کرنا پڑتا ہے اور اسے درجہ کمال تک پہنچانے میں مدد کرنی ہوتی ہے۔ نہ خالی عقل کی نگاہ سے یہ امکانات دکھائی دیتے ہیں، نہ خالی وجدان اور طبیعت کی ذکاوت پر استاد بھروسہ کرسکتا ہے۔ یہاں عقل اور وجدان کو ملانے کی ضرورت ہوتی ہے۔" عقل اور وجدان کی یہ ہم آہنگی بڑے خلوص اور بڑے ریاض کا ثمرہ ہے۔ جوش اور ولولہ کی صفت بھی اس کے لیے درکار ہے۔ اس کے لیے عقل میں باریک بینی بھی چاہیے اور جذبات میں وسعت اور گہرائی بھی۔ ذاکر صاحب کے الفاظ میں "اچھے استاد کی جذباتی زندگی میں وسعت بھی ہوتی ہے، گہرائی بھی اور پائیداری بھی۔ اس کی روح میں حق و صداقت، حسن و جمال، نیکی اور تقدس، انصاف اور آزادی کے مظاہرے سے ایک گرمی پیدا ہوتی ہے جس سے وہ دوسرے کے دلوں کو گرماتا ہے اور جس میں تپا تپا کر اپنے شاگردوں کی سیرت کو اُبھارتا ہے۔"

استاد کا کام سیرت گری ہے صورت گری نہیں۔

میں نے عمداً اپنے مضمون کے ابتدائی حصے میں ایک اچھے استاد کے بارے میں ذاکر صاحب کے خیالات کو ذرا تفصیل سے آپ کے سامنے پیش کیا ہے۔ میرے خیال میں بغیر ان کو جانے ہوئے ہم بچوں کی تعلیم و تربیت سے متعلق اُن کے خیالات کی صحیح اسپرٹ کو نہیں سمجھ سکتے۔ ان کے نزدیک بچوں کی اچھی تعلیم و تربیت کے لیے اچھے والدین اور اچھے استاد کا ہونا ناگزیر ہے۔ انھیں کی سمجھداری اور پُرخلوص کوششوں سے بچہ اپنی خداداد صلاحیتوں کو بروئے کار لاتا ہے اور زندگی کے پُرپیچ منازل سے جہاں قدم قدم پر ٹھوکروں کا امکان ہے آسانی سے گزر جاتا ہے لیکن اس کے برخلاف انھیں کی ناسمجھی اور بے تعلقی کے باعث تباہی و بربادی کے گہرے غار میں جا گرتا ہے۔ جس وقت سے بچہ پیدا ہوتا ہے اور جب تک وہ سنِ بلوغ تک نہیں پہنچ جاتا اس کی تعلیم و تربیت بڑی سوجھ بوجھ اور محنت کی طالب ہے۔

ذاکر صاحب نے اس وقت جب ہمارے ملک میں ابتدائی تعلیم سے پہلے کی تعلیم (NURSERY EDUCATION) پر کوئی توجہ نہ تھی اس کی اہمیت کو محسوس کیا اور اس سلسلے میں مغربی مفکروں کے خیالات کو بڑے دلنشیں انداز میں اپنے ملک والوں کے سامنے پیش کیا تاکہ وہ بھی ان کی تعلیمی اہمیت کو سمجھ سکیں۔ آج یہ بات تعلیمی پیشہ کا ہر چھوٹا بڑا جانتا ہے کہ بچہ کی ذہنی اور اخلاقی ترقی کی بنیادیں زندگی کے پہلے پانچ سالوں میں پڑتی ہیں اور اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ آج نرسری ایجوکیشن (NURSERY EDUCATION) پر بڑا زور دیا جا رہا ہے لیکن جس وقت ذاکر صاحب نے اس طرف توجہ دلائی تھی ہمارے ملک کے لیے یقیناً یہ ایک نئی بات تھی۔ اپنے ایک خطبۂ صدارت میں جو انھوں نے ۲۴ فروری ۱۹۴۶ء کو نیو ایجوکیشن فیلوشپ (NEW EDUCATION FELLOWSHIP) کے اجلاس منعقدہ سینٹرل ٹریننگ کالج لاہور میں دیا تھا بچہ کی عمر کے ابتدائی پانچ سالوں کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے انھوں نے فرمایا تھا کہ "اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر ہماری قومی زندگی کی تشکیل اور تنظیم کے ذمہ دار واقعی اپنے فرض سے عہدہ برآ ہونا چاہتے ہیں تو انھیں اس عمر کے بچوں کی تربیت کو پہلے سے زیادہ اپنے منصوبوں میں جگہ دینی ہوگی"۔ بچوں کی ان تربیت گاہوں کے بارے میں ذاکر صاحب نے صاف صاف فرمایا کہ "ان نئی تربیت گاہوں کو بناتے وقت یہ بات سامنے رکھنی چاہیے کہ یہ گھر کا بدل بھی ہیں اور گھر کی کمیوں کو پورا کرنے والی بھی"۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ گھر میں اور ان تربیت گاہوں میں بہت قریب کا رشتہ قائم ہونا لازم ہے تبھی یہ تربیت گاہیں اپنا کام بخوبی انجام دے پائیں گی۔ ان بال باڑیوں یا تربیت گاہوں کا مقصد ذاکر صاحب کے خیال میں اچھی عادتیں ڈالنا اور ایسا ماحول پیدا کرنا ہے جس میں وہ اپنی عمر کے تقاضوں کے اعتبار سے وہ سیکھ سکیں جو فطرت چاہتی ہے کہ وہ سیکھ جائیں۔

بدنی نشو و نما۔ اپنے ماحول سے آگاہی۔ بنیادی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کی کوشش۔ سماجی شعور کی تربیت یہی وہ اہم مقاصد ہیں جو وہ ان تربیت گاہوں کے ذریعہ پورا ہوتے دیکھنا چاہتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ایسی تربیت گاہوں سے نکل کر جب بچے اسکول کی دنیا میں قدم رکھیں گے تو وہ اپنے کو وہاں کے کاموں کے لیے زیادہ آمادہ اور تیار پائیں گے۔

ابتدائی تعلیم سے متعلق ذاکر صاحب کے خیالات سند کی حیثیت رکھتے ہیں تعلیم کا یہی وہ میدان تھا جو ابتدا سے ذاکر صاحب کی توجہ کا مرکز اور ان کے عمل کی جولانگاہ بنا رہا۔ قدرت نے انھیں بچوں کو سمجھنے اور اُن کے ساتھ مناسب برتاؤ کرنے کی ایسی صلاحیت عطا کی تھی جو ذرا کم استادوں کے حصہ میں آتی ہے۔ انھوں نے بچوں کی تعلیم و تربیت کے بارے میں جو باتیں کہی ہیں وہ محض کتابی نہیں اُن کی بنیاد ذاتی تجربے اور نظر کی گہرائی پر ہے۔ جب وہ بچوں کی تربیت کے بارے میں باتیں کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بچے کی کتاب زندگی کا ورق ان کے سامنے کھلا ہوا ہے اور وہ دیکھ رہے ہیں کہ بچہ کو اب کس بات کی ضرورت ہے اور اب کس بات کی۔ جیسے ایک مشاق مالی یہ جانتا ہے کہ اس کے ننھے ننھے پودوں کو اپنی مکمل نشو و نما کے لیے کس وقت کیا چیز درکار ہے۔ ذاکر صاحب بچہ کی فطرت کا عجیب و غریب درک رکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک بچہ اپنی گوناگوں صفات و کیفیات کے باعث دنیا کی ساری مخلوق سے زیادہ حیرت میں ڈالنے والی شے ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ ماں باپ، استاد اور دوسرے لوگ اس کی تعلیم و تربیت کے معاملہ میں بڑے اہتمام سے کام لیں تاکہ قدرت کا مقصد پورا ہو سکے۔ وہ اس کے قوائے ذہنی و جسمانی کی مکمل تربیت چاہتے ہیں۔ ان کا اعتقاد ہے اور آج کے تعلیمی مفکرین اور ماہرین نفسیات اس بات پر متفق ہیں کہ بچہ کی شخصیت ایک اکائی کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کو خانوں میں بانٹ کر نہ تو سمجھا جا سکتا ہے اور نہ اس کی تعمیر کی جا سکتی ہے۔ ذاکر صاحب کی بنیادی تعلیم کے لائحہ عمل کا کلیدی یہی سب سے اہم نکتہ ہے۔ وہ ذہنی کام اور عملی کام میں بہت قریب کا رشتہ قائم کرنا چاہتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ ایک صحت مند شخصیت کی تعمیر میں دونوں لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ چھ سات سال کی عمر کے بچوں کی تربیت ذہنی کے لیے وہ فرماتے ہیں۔

"اس عمر میں فطرت کا منصوبہ یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہاتھوں کی مدد سے سوچیں۔ چیزوں کو برت کر پہچانیں اور کام کر کے سیکھیں۔ یہ بڑی ہی گمراہی ہے کہ ہم اس عمر کے بچوں کے لیے ذہنی تربیت کے اس امکان کو یعنی عملی کام کو ان کی تعلیم میں جگہ نہیں دیتے اور فطرت کے تقاضوں کو ٹھکرا کر اپنی من مانی تدبیروں سے عملی تربیت کی جگہ خالی ملمع کاری پر زور دیتے رہتے ہیں۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ اس میں دورائی کی ذرا گنجائش نہیں

ہے کہ اس منزل میں عملی کام کو تعلیمی سعی کا مرکز بنایا جائے۔"

یہاں یہ بات واضح کر دینا ضروری ہے کہ عملی کام سے ان کی مراد میکانکی کام نہیں ہے بلکہ ایسا کام جو ذہنی نمو میں معاون ہو سکے۔ اسے وہ تخلیقی ہنرمندی کے نام سے بھی یاد کرتے ہیں جو میکانکی ہنرمندی سے بالکل مختلف شے ہے۔ "میکانکی ہنرمندی میں سوجھ بوجھ کی ضرورت نہیں بس مشقت درکار ہے۔ لیکن تخلیقی ہنرمندی ذاتی صلاحیت کی بنا پر نئی اقدار پیدا کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔" اسی وجہ سے وہ تجربہ سے حاصل کیے گئے علم کو روایتی خبری علم سے کہیں زیادہ اعلیٰ و ارفع مانتے ہیں۔ اپنے خطبۂ صدارت میں جس کا حوالہ اوپر دیا گیا ہے ایک جگہ وہ فرماتے ہیں "روایتی خبری علم بے جان ہوتا ہے اور بے نور۔ اس سے نہ دماغ کو روشنی نصیب ہوتی ہے اور نہ روح کو بالیدگی۔ اکثر یہ نفس کی عیب پوشی کے لیے ایک خوشنما پردہ ہوتا ہے یا ایک خالی ظرف پر چڑھا ہوا چمڑا۔ آواز بہت دیتا ہے اور اندر سے ہوتا ہے کھوکھلا۔ تجربہ سے حاصل کیا ہوا علم انکسار پیدا کرتا ہے اور وقار۔ ذہن کو تربیت دیتا ہے۔ روح کی پرورش کرتا ہے اور ہمیشہ آگے بڑھنے کی طاقت بخشتا جاتا ہے۔"

بات یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی۔ ذاکر صاحب کے تعلیمی افکار کی بلندی کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب وہ بچے کی صلاحیتوں اور ہنرمندیوں کی نشو و نما کے مقصد پر روشنی ڈالتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں "ہم نے اگر ذہنی قوتوں کو نشو و نما دینے کا انتظام کر دیا، اگر ہنرمندیاں پیدا کر دیں تو تعلیم کا کام ختم نہیں ہو گیا۔ صلاحیتیں اور ہنرمندیاں نہ اچھی ہوتی ہیں اور نہ بری وہ اچھی اور بری بنتی ہیں ان مقاصد سے جن کی خدمت میں لگائی جائیں۔" کتنے پتے کی بات کہی ہے ذاکر صاحب نے۔ آج ہمارے دفاتر اور کارخانوں میں جو خود غرضی، دھوکہ بازی، لوٹ کھسوٹ اور رشوت ستانی کا بازار گرم ہے اس کی صرف وجہ یہ ہے کہ زمانۂ تعلیم میں اس بات پر توجہ نہیں دی جاتی کہ ذہنی صلاحیتوں اور مہارتوں کو اچھے مقاصد کا خادم بنایا جائے۔ ذاکر صاحب کے الفاظ میں "تعلیم مہارتوں سے نہیں ہوتی۔ مہارتوں کو اچھے مقاصد کا خادم بنانے سے ہوتی ہے۔ جمہوری جماعت میں اس حقیقت کو نظر انداز کرنا جماعت کی زندگی کی شرائط سے غفلت برتنا ہے۔ جب تک فرد اپنی قوتوں کو جماعت کی خدمت کے لیے صرف کرنا نہ سیکھے اس وقت تک اس کی ہنرمندی جماعت کے انتشار کا باعث بن سکتی ہے۔" اسی لیے ذاکر صاحب نے بنیادی نظام تعلیم میں جماعتی کام کی اہمیت پر زیادہ زور دیا ہے تاکہ مدرسے "انفرادی خود غرضی" کی جگہ "بے غرض جماعتی خدمت" کی تربیت گاہ بن سکیں۔

ذاکر صاحب نے بچوں کی تعلیم و تربیت کے بارے میں اپنے خیالات کو اپنی تین تقریروں میں جو مارچ اپریل ۱۹۳۶ء میں آل انڈیا ریڈیو دہلی سے نشر کی گئیں بڑے سیدھے سادے اور دل نشیں انداز میں پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور تقریر "ننھا مدرسے چلا" جو ۱۳ مئی ۱۹۴۲ء کو آل انڈیا ریڈیو سے نشر کی گئی

تھی۔ ان کی بچوں کی نفسیات سے واقفیت کا پتہ دیتی ہے۔ یہ چاروں تقریریں ان کی کتاب "تعلیمی خطبات" جسے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر نئی دہلی نے شائع کیا ہے۔ یہاں پر انھیں تقریروں میں سے چند باتوں کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے۔

اپنی پہلی تقریر میں انھوں نے بچوں کی تربیت میں ماں باپ، دادا دادی، نانا نانی اور اس کے بعد استاد کی ناسمجھیوں اور نادانیوں کا ذکر کیا ہے جو اپنے لاڈ پیار یا بے جا سختی کے برتاؤ سے بچے کے ذہن میں طرح طرح کی گتھیاں ڈال دیتے ہیں جو عمر بھر سلجھائے نہیں سلجھتیں۔ غلط تربیت سے یا تو بچے میں کمی اور گھٹیا پن کا احساس غیر ضروری شدت کے ساتھ پیدا ہو جاتا ہے اور یا ان کمیوں کی تلافی کی کوشش میں وہ حد اعتدال سے تجاوز کرنے لگتا ہے اور ایسے کاموں کے کرنے پر مجبور ہوتا ہے جو سماجی اور اخلاقی دونوں حیثیتوں سے قابل معافی نہیں ایسی ہی تربیت کے زیر اثر ہمارے فارغ التحصیل نوجوانوں کی شخصیت کا کیا اچھا خاکہ ذاکر صاحب نے ان الفاظ میں کھینچا ہے۔

"جب یہ دنیا میں خدا کی خلافت کا کاروبار سنبھالنے نکلتے ہیں تو نہ تن درست ہوتا ہے نہ من۔ نہ ولولہ نہ امنگ۔ نہ ہمت نہ یقین۔ ڈرے ڈرے، سہمے سہمے۔ ہر چیز سے خوف، ہر چیز پر شبہ۔ نہ کسی سے لگاؤ نہ کسی پر بھروسہ۔ نہ کام کا شوق نہ تفریح کا سلیقہ۔ کچھ کرتے بھی ہیں تو غلاموں کی طرح۔ سزا کے ڈر سے یا انعام کے لالچ سے۔ نہ اپنے اردگرد کی حقیقتوں سے آشنا نہ ان سے دوچار ہونے کی قابلیت۔ خیالی پلاؤ پکاتے ہیں اور ہوائی منصوبے گانٹھتے ہیں جنھیں قدم قدم پر زندگی کی سخت حقیقت پاش پاش کر دیتی ہے۔ یہ زندگی کو بے کار جاننے لگتے ہیں اور زندگی ان سے بیزار رہتی ہے۔ دنیا ان کے لیے قید خانہ اور یہ دنیا کے لیے عذاب۔" یہ ہے ہماری تعلیم کا ماحصل۔ ایسی تعلیم جو بچوں کو ایک ناسمجھ جانور۔ ان کے ذہنوں کو ایک گہرا خالی برتن۔ ان کے دلوں کو احساسات و جذبات سے خالی۔ ان کی شخصیت کو خواہشوں اور ضرورتوں سے عاری اور انفرادیت سے معرا سمجھتی ہیں۔ ذاکر صاحب ایسی تعلیم کے سخت مخالف تھے۔ ان کا خیال تھا کہ بچہ خود اپنی ایک انفرادی شان رکھتا ہے۔ اس کی خود اپنی صلاحیتیں اور قوتیں ہوتی ہیں۔ اس کی شان کو اونچا اٹھانے کے لیے اور اس کی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے لیے اُسے مدد کی ضرورت ہے۔ ہدایت کی ضرورت ہے۔ ہمدردی اور محبت کی ضرورت ہے۔ سمجھنے سمجھانے کی ضرورت ہے۔ اس میں شک نہیں کہ کام مشکل ہے پر صرف سہل کام ہی تو کرنے کے نہیں ہوتے۔"

اپنی دوسری تقریر میں ذاکر صاحب نے والدین کو ان غلطیوں سے آگاہ کرایا ہے جو عام طور پر ان سے سرزد ہوتی ہیں جن سے اگر وہ آگاہ ہو جائیں تو شاید ان سے بچ جائیں۔ سب سے پہلی غلطی جو اکثر والدین سے سرزد ہوتی ہے اور جس کی وجہ سے بچے کو اپنے تعلیمی کاموں میں دشواریاں پیش آتی ہیں۔ وہ یہ کہ انھیں یا تو

اپنے بچے کی ان خرابیوں کا علم نہیں ہوتا جو وہ ساتھ لے کر پیدا ہوتا ہے یا علم ہوتا ہے تو وہ ادھر توجہ نہیں کرتے ان میں آنکھ کی خلقی خرابیاں، بہرا پن اور بیہتا پن خاص ہیں۔ ماں باپ کا اعتدال سے بڑھا ہوا لاڈ پیار بھی بچہ کو بے بس اور کمزور کر دیتا ہے۔ اس میں خود اعتمادی اور اپنی کوششوں سے کچھ حاصل کرنے کی خواہش کو ختم کر دیتا ہے اور سب سے بڑھ کر ذہن کی تخلیقی صلاحیتوں کو ہمیشہ کے لیے سلا دیتا ہے۔ ایسے ہی بچوں میں اکثر ہکلے پن، شرمیلے پن اور نفسیاتی گھبراہٹ کی شکایات پیدا ہو جاتی ہیں۔ خاص خاص موقع جن پر والدین کو ہوشیاری اور سمجھ داری سے کام لینا چاہیے وہ ہیں جب بچہ کسی محرومی سے دوچار ہوتا ہے مثلاً دودھ کا چھٹنا یا جانا یا گھر میں دوسرے بچہ کی ولادت کے سبب ماں کی گود کا از خود چھوٹ جانا اور پیار و محبت کا بٹ جانا وغیرہ وغیرہ۔ یہ موقعے بچہ کی ذہنی زندگی کو متلاطم کر دیتے ہیں۔ اور اگر والدین سمجھ داری سے کام نہ لیں اور اس توجہ اور ہمدردی کو نہ برتیں جس کی اُسے ایسے موقعوں پر سخت ضرورت ہے تو بچے کی شخصیت پر بہت بُرا اثر پڑتا ہے۔ یہاں پر ان باتوں کو بسط سے بیان کرنے کا موقع نہیں صرف یہ بتا دینا کافی ہے کہ بچوں کی بہت سی تکلیف دہ شرارتوں کے پیچھے ان کی وہ توجہ طلبی چھپی ہوتی ہے جو اپنی محرومیوں کی تلافی کے خیال سے ان میں پیدا ہوتی ہے۔

اپنی تیسری تقریر میں انھوں نے بچہ کی زندگی کی ان دقتوں کا تذکرہ کیا ہے جو اسے پہلے پہل مدرسے جاتے وقت پیش آتی ہیں۔ اگر بچہ کو پہلے سے اس موقع کے لیے تیار نہیں کیا گیا ہے تو اسکول جانے کا پہلا پہلا تجربہ بھی بچہ کی زندگی پر بُرے اثرات چھوڑ سکتا ہے یہاں تک کہ اسے اسکول اور پڑھنے پڑھانے کے کاموں سے نفرت بھی پیدا کرا سکتا ہے۔ خود اسکول کا ماحول بھی کبھی کبھی بُرے اثرات مترتب کرنے کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ جس اسکول میں بچے کو ڈرا دھمکا کر رکھا جاتا ہے۔ ڈسپلن کی زنجیروں سے اس کے ذہن اور جسم کو جکڑ دیا جاتا ہے۔ استاد اور شاگرد میں قریب کا رشتہ قائم نہیں ہو پاتا۔ نصاب حاکم ہوتا ہے اور بچہ محکوم وہ بچہ کے لیے جیل خانہ سے کم نہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے اسکولوں میں بچہ کی شخصیت اور ذہن میں کیا بالیدگی پیدا ہو سکتی ہے اور وہ تعلیم کے صحیح مقصد کو کب پورا کر سکتے ہیں۔ ذاکر صاحب نے ایسے اسکولوں کی بڑی مذمت کی ہے۔ ان کی نگاہ میں ایک اچھا اسکول وہ ہے جس کے استاد یہ سمجھیں کہ وہ کسی ایسے کارخانے کے کام کرنے والے نہیں ہیں جس میں سے سب مال ایک ہی ٹھپے اور ایک ہی مار کے کا نکلنا ضروری ہے بلکہ جو مختلف قسم کی صلاحیتیں ان کی امانت میں دی جاتی ہیں انھیں درجۂ کمال تک پہنچانے میں مدد دینا ان کا سب سے بڑا فرض ہے۔" اپنی اس تقریر میں ذاکر صاحب نے استادوں کی بعض اُن غلطیوں کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جو ان سے عام طور پر سرزد ہوتی ہیں اور جن کی وجہ سے بچہ کی تربیت

پر بُرا اثر پڑتا ہے۔ مثلاً ایک بہت ہی عام غلطی طرف داری اور ناانصافی کی ہے جس کا بچے بہت گہرا اثر لیتے ہیں۔ جو اکثر عمر بھر ان کے ذہن سے نہیں ہٹتا اور" مدرسے کے بہت سے دوسرے اچھے اثرات اسی احساس کی وجہ سے مٹ جاتے ہیں۔" سزا کے معاملے میں بھی استاد بہت غلطیاں کرتے ہیں۔ ذاکر صاحب کی نگاہ میں" سزا کی اگر کوئی تعلیمی اور تربیتی حیثیت ہے تو بس یہ کہ یہ کفارہ کی صورت ہے جس سے ضمیر کی کھٹک رفع ہو جاتی ہے اس لیے سزا کو کبھی ڈرانے دھمکانے کا ذریعہ نہ ہونا چاہیے احساس جرم سے نجات دلانے کا وسیلہ ہونا چاہیے ورنہ یہ تربیت کی راہ میں حائل ہوتی ہے۔ سچی اور مفید سزا اسی وقت ممکن ہے کہ بچے کو اپنے قصور کا احساس ہو جائے۔ اس پر افسوس اور ندامت پیدا ہو اور اس کے دل میں آپ ہی کفارہ یا تلافی کا خیال آئے ورنہ سزا ڈرانا ہے علاج نہیں۔"

بچوں کی تعلیم و تربیت کے بارے میں ذاکر صاحب کے یہ خیالات آج بھی اتنے ہی جدید ہیں جتنے وہ آج سے تیس پینتیس سال قبل تھے جب ان کا اظہار کیا گیا۔ دراصل ذاکر صاحب محض ایک "تعلیمی مفکر" ہی نہ تھے بلکہ وہ ایک "عملی معلم" بھی تھے اور یہی وجہ ہے کہ پچھلے تیس برسوں کی علمی تحقیقات کے باوجود بچوں کی تعلیم و تربیت کے بارے میں اُن کے خیالات میں آج بھی وہی تازگی ہے جو اس وقت تھی جب ذاکر صاحب انھیں منظر عام پر لائے۔

میں اپنے اس مضمون کا اختتام اس سے بہتر طور پر نہیں کر سکتا کہ خواجہ غلام السیدین صاحب کے ان الفاظ کو یہاں پر نقل کروں جو انھوں نے ذاکر صاحب کے لیے اپنے مضمون "مرد مومن" میں استعمال کیے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:-

"ذاکر صاحب کی عظمت بہ حیثیت ایک معلم کے دراصل اس وجہ سے نہیں کہ اُن کو موجودہ اور قدیم تعلیمی اصولوں اور طریقوں سے بہت اچھی واقفیت ہے یا انھوں نے ایک بہت مشہور درسگاہ کی بنیاد ڈالی ہے اور اس کو پروان چڑھایا ہے بلکہ اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ ان کی اپنی ذات ہماری بہترین اخلاقی اور تہذیبی قدروں کی حامل ہے اور عصر حاضر کے شیطانی ہیجان میں انھوں نے اپنے مذاق سلیم اور احساس صالح کو قائم رکھا ہے اور یہ چیز علم اور عمل کے کارناموں سے بھی کہیں زیادہ وقیع ہے۔"

آوازۂ خلیل ز بنیاد کعبہ نیست
مشہور گشت زانکہ در آتش نکو نشست

عبد العلی خاں اخگرؔ

قطعۂ تاریخ وفات

عالی جناب ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب مرحوم
صدر جمہوریہ ہند

وا دریغا ڈاکٹر ذاکر حسین
کرد رحلت زین جہانِ پُر الم
روز شنبہ ثالثِ ماہِ مئی
رفت از دارِ فنا آں محترم
اخگرؔ از ہاتف پئے سالش شنید
شد زگیتی بہر گلگشتِ ارم

۱۹ ۶ ۶۹

پروفیسر آل احمد سرور

ذاکر صاحب کی یاد میں

ذاکر صاحب کو موت کے ظالم ہاتھوں نے ہم سے چھین لیا نہیں۔ ذاکر صاحب زندہ رہیں گے اور انھیں کوئی ہم سے جدا نہیں کر سکتا۔ ۳ مئی کی دوپہر کو ریڈیو سے یہ خبر ملی کہ حرکت قلب بند ہو جانے کی وجہ سے اچانک گیارہ بج کر بیس منٹ پر ذاکر صاحب کا انتقال ہو گیا۔ یہ واقعہ سنیچر کا ہے۔ اس سے پہلے اتوار کو وہ ناگالینڈ کے دورے سے واپس آئے تھے۔ فروری میں غالب صدی کی تقریبات میں جب انھیں دیکھا تھا تو زکام اور کھانسی کی وجہ سے آواز بھاری تھی اور ان کی صحت کچھ گرتی ہوئی معلوم ہوتی تھی، مگر چونکہ ان کی دیکھ بھال برابر ہوتی رہتی تھی اور دوا اور احتیاط کا سلسلہ جاری تھا اس لیے کوئی تشویش نہ تھی۔ ۳ مئی کی صبح کو وہ معمول کے مطابق بیدار ہوئے، نماز پڑھی، اخبار دیکھے اور اپنا کام کیا۔ ۱۱ بجے ان کا ڈاکٹر ان کا روزمرہ کا معائنہ کرنا چاہتا تھا اور چونکہ گلا کچھ خراب تھا اس لیے ایکسرے بھی لینا چاہتا تھا۔ قبل اس کے معائنہ شروع ہو وہ غسل خانے میں گئے۔ جب وہاں سے نکلنے میں دیر ہوئی تو جاں نثار خادم اسحاق کو وحشت ہونے لگی۔ غسل خانے کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ وہ ایک دوسرے دروازہ سے اندر گیا تو دیکھا کہ وہ فرش پر پڑے ہیں۔ اس نے گھبرا کر ڈاکٹروں کو آواز دی انھوں نے دیکھا تو قلب کی حرکت بند تھی۔ اس وقت انھوں نے دل کو حرکت میں لانے کے لیے تمام ممکن تدابیر کیں مگر کوئی پیش نہ گئی۔ ذاکر صاحب ۱۱ بج کر ۲۰ منٹ پر اپنے رفیق اعلیٰ سے جا ملے تھے۔

ذاکر صاحب نے بہتر برس کی عمر پائی۔ اسی فروری میں ان کی بہترویں سالگرہ منائی گئی تھی۔ فروری کا مہینہ ضرور ان کی پیدائش کا مہینہ تھا مگر اپنی تاریخ پیدائش انھیں معلوم نہ تھی۔ لوگوں نے ایک دن مان لیا تھا۔ کچھ دن کم دو سال پہلے انھوں نے صدر جمہوریہ کے عہدے کی ذمہ داری سنبھالی تھی۔ اس منصب جلیلہ پر وہ دو سال سے بھی کم مدت فائز رہے۔ مگر صدر جمہوریہ تو وہ اب ہوئے، ملک و قوم

کے محبوب تو پرسوں سے تھے ۔ اندرا گاندھی نے درست کہا تھا کہ "انھیں صدر اس وجہ سے منتخب نہیں کیا گیا تھا کہ وہ عقیدے کے اعتبار سے یا پیدائش کی وجہ سے مسلمان تھے ۔ انھیں ہندوستان کا پہلا شہری اس لیے منتخب کیا گیا تھا کہ وہ ملک کے سب سے ممتاز شہری تھے"۔ کسی مذہب کا ماننے والا ہو، کسی سیاسی پارٹی کا فرد ہو، کسی علاقے کا رہنے والا ہو اب تو سبھی اس بات پر متفق تھے کہ ذاکر صاحب کی صدارت سے اِس مسند کو زینت تھی، سبھی کو احساس تھا کہ ایسی علمی قابلیت، ذہنی صلاحیت، اعلیٰ کردار، وسعت قلب، تہذیب، رواداری، انسانیت، شرافت، خلوص اور محبت کا مجموعہ صدیوں میں پیدا ہوتا ہے۔

ذاکر صاحب قائم گنج کے پٹھانوں کے ایک ممتاز خاندان سے تھے۔ حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ گھر پر تعلیم کے بعد، اٹاوے کے اسکول میں اور پھر ایم۔ او۔ کالج میں تعلیم پائی۔ اٹاوے کے اسکول میں ان کا یہ حال تھا کہ بلقان کی لڑائی کی خبریں معلوم کرنے ریلوے اسٹیشن اخبار لینے جایا کرتے تھے اور مسجدوں میں زخمیوں کے لیے چندے کی اپیل کرتے تھے۔ اس زمانے میں بھی ان کی خطابت اور قیادت کے جوہر نمایاں ہو چلے تھے۔ لوگوں سے کہتے تھے کہ آپ جو پیسے دیں گے ان کی گولیاں بنائی جائیں گی اور یہ گولیاں دشمنوں کے سینوں کے پار ہوں گی۔ علی گڑھ آئے تو ان کی ذہانت کے جوہر اور کھلے۔ وہ کلاس میں کم نظر آتے تھے، لائبریری میں زیادہ۔ حاضریاں کم رہتی تھیں مگر درجے میں اوّل آتے تھے۔ ان کے ساتھی حبیب الرحمٰن مرحوم کا بیان تھا کہ بی۔ اے کے امتحان کے لیے ذاکر صاحب نے مطالعہ بہت کم کیا تھا۔ حبیب الرحمٰن نے خوب تیاری کی تھی اور بڑے جامع نوٹ تیار کیے تھے۔ ذاکر صاحب نے ان سے وہ نوٹ دیکھنے کو مانگ لیے۔ انھوں نے رحم کھا کر دے دیئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ذاکر صاحب کالج میں اول آئے، حبیب الرحمٰن تیسرے نمبر پر۔ یونین کے نائب صدر کی حیثیت سے وہ طلبہ کے مسلمہ لیڈر تھے۔ جب ترک موالات کی تحریک شروع ہوئی اور گاندھی جی، شیخ الہند مولانا محمود الحسن اور مولانا محمد علی علی گڑھ آئے تو شروع میں ذاکر صاحب خاموش تھے مگر ایک تقریر نے انھیں اس درجہ متاثر کیا کہ وہ کالج کو چھوڑ کر جامعہ جانے والوں کی صف میں شامل ہو گئے یہ جذباتی طوفان بہت سے لوگوں کے دلوں میں آیا تھا جب سکون ہوا تو یہ لوگ واپس آ گئے، ذاکر صاحب اور ان کے چند ساتھی ڈٹے رہے، مشکلات کا مقابلہ کرتے رہے "قانون باغبانی صحرا" لکھتے رہے، عشق کی وادی میں قدم رکھا تو پھر منزل پر پہنچ کر ہی دم لیا۔

جامعہ سے ہی وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے جرمنی گئے۔ وہاں نہ صرف پروفیسر زومبارٹ کی نگرانی میں اقتصادیات میں پی۔ ایچ۔ ڈی کیا، بلکہ جرمنی میں مقیم ہندوستانی طالب علموں سے رابطہ پیدا کیا۔ یہیں انھیں عابد حسین اور محمد مجیب جیسے ساتھی ملے، یہیں انھوں نے دیوان غالب کا برلن اڈیشن شائع کیا جس کے کچھ اوراق

کے لیے انھوں نے ٹائپ خود کمپوز کیا۔ جرمنی میں ہی انھیں یہ خبریں مل گئی تھیں کہ وہ قومی رہنما جنھوں نے جامعہ قائم کی تھی اب مشکلات سے گھبرا کر اسے بند کرنا چاہتے ہیں اور انھوں نے لکھا تھا کہ یہ فیصلہ اس وقت تک ملتوی کر دیا جائے جب تک وہ واپس نہ آجائیں۔ اپنی واپسی پر انھوں نے اپنے ساتھیوں کو جمع کیا۔ ان سے بیس برس خدمت کرنے کا عہد لیا اور ان سب کی طرف سے جامعہ کے چلانے کی ذمہ داری لی۔ چنانچہ جامعہ ذاکر صاحب اور ان کے ساتھیوں کے سپرد کر دی گئی۔ اس قومی ادارے کو ذاکر صاحب نے وقتی سیاست سے الگ رکھا مگر حقیقی سیاست پر ان کی نظر رہی۔ یہ ایک ایسا قومی ادارہ تھا جس میں قومی یک جہتی، آزادی کی جد و جہد، برطانوی سامراج سے بیزاری، قومی تعلیم، مشرقیت، مذہبی ماحول، جدید تصورات، تصنیف و تالیف سبھی کی گنجائش رکھی گئی تھی، یہ قرول باغ کے کرائے کے مکانوں میں تھی۔ ذاکر صاحب نے اوکھلے میں زمین حاصل کی، جامعہ کی عمارتوں کا نقشہ بنایا، ہمدردان جامعہ کا ایک حلقہ قائم کیا، ملک بھر کے دورے کیے، سرکاری امداد کی طرف قطعاً توجہ نہ کی مگر عوام اور اہل خیر حضرات سے برابر اپیل کرتے رہے۔ بچوں کا ایک اچھا مدرسہ چلایا جس میں اخلاق کے سدھار، پابندیٔ اوقات، اچھی تعلیم، قومی تصور پر خاص زور دیا جاتا تھا۔ رسالہ جامعہ کے ذریعہ سے سماجی علوم اور ادبیات پر اچھے مضامین لکھوائے۔ مکتبۂ جامعہ کے ذریعہ سے اچھی اور معیاری کتابیں شائع کیں مخلص اور محنتی کارکنوں کا ایک حلقہ اپنے گرد جمع کر لیا اور یہ سب ایسے حالات میں کیا کہ مالی وسائل بہت کم تھے، تنگی ترشی سے گزر ہوتی تھی۔ ذاکر صاحب ابتدائی اسکول کے بچوں کو کبھی کبھار درس بھی دیتے تھے کالج میں اور ثانوی مدرسے میں بھی کبھی کبھار پڑھاتے تھے۔ جامعہ کے کاموں کی نگرانی بھی کرتے تھے، ملک کا دورہ بھی کرتے تھے، دنیا بھر کے سربھروں سے ملتے بھی تھے، گپ بھی کرتے تھے، دوستوں کی دعوتوں میں شریک بھی ہوتے تھے۔ ان کی ہر چیز میں ایک سادگی اور نفاست، ان کی ہر بات میں حکیمانہ نکتہ سنجی اور شاعرانہ شوخی برابر ملتی تھی۔ علی گڑھ چھوڑ کر جامعہ کو اپنایا تھا۔ اس وقت علی گڑھ جن خطوط پر چل رہا تھا ان سے اتفاق نہ کرتے تھے، مگر علی گڑھ آتے، یہاں کے علمی کاموں میں شریک ہوتے، ہر ایک سے اس کی صلاحیت کے مطابق گفتگو کرتے۔ ہم جیسے نوجوانوں کے ذہن میں روشنی کرتے اور دل میں کوئی چنگاری روشن کرتے۔ ہم میں سے ہر ایک یہ سمجھتا کہ شاید ہم سے زیادہ کسی کو نہیں چاہتے۔ میری زندگی کے کئی اہم فیصلے ذاکر صاحب کی وجہ سے ہوئے ہیں۔ ان پر آج تک مجھے افسوس نہیں ہے بلکہ فخر ہے۔

ذاکر صاحب جامعہ کی خدمت میں جی جان سے لگے ہوئے تھے کہ ۱۹۳۷ء میں گاندھی جی نے ابتدائی تعلیم کے مسئلے پر ایک سلسلۂ مضامین شروع کیا۔ ان کی دور بیں نگاہوں نے یہ دیکھ لیا تھا کہ سارے ملک

میں لازمی ابتدائی تعلیم کے لیے جو رقم درکار ہوگی وہ حکومت کے وسائل سے فراہم ہونا مشکل ہے اس لیے انھوں نے یہ تجویز کیا کہ بچوں کو کوئی پیشہ یا کام سکھایا جائے اور وہ جو چیزیں بنائیں وہ بازار میں فروخت ہوں تاکہ ان کی آمدنی سے اسکول کا خرچہ چل سکے۔ اکتوبر ۱۹۳۷ء میں انھوں نے وردھا میں ماہرین تعلیم کی ایک کانفرنس بلائی اور اپنا نظریہ اس کانفرنس میں پیش کیا۔ ذاکر صاحب بھی کانفرنس میں مدعو تھے۔ انھوں نے گاندھی جی کے اس خیال سے سختی سے اختلاف کیا کہ بچوں کی بنائی ہوئی چیزوں کی آمدنی سے اسکول کا خرچہ چلایا جائے۔ ہاں انھوں نے ہاتھ کے کام کا تخلیقی صلاحیت کو ابھارنے میں جو رول ہے اس پر بہت زور دیا اور کہا کہ گو بچوں کی بنائی ہوئی چیزیں ایسی ہونی چاہئیں کہ بازار میں رکھی جاسکیں مگر اس آمدنی سے ہی اسکول کا چلانا اسکولوں کو فیکٹریوں اور کارخانوں میں تبدیل کر دے گا۔ گاندھی جی نے ذاکر صاحب کے نقطۂ نظر کو سمجھ لیا اور قومی تعلیم کے لیے ایک خاکہ بنانے کی غرض سے جو کمیٹی بنائی اس صدر ذاکر صاحب کو مقرر کیا۔ ذاکر صاحب نے چند ماہ میں رپورٹ تیار کر دی جو وار دھا اسکیم یا بنیادی تعلیم اسکیم کے نام سے یاد کی جاتی ہے۔ اس رپورٹ کی وجہ سے تعلیمی حلقوں میں ذاکر صاحب کی عظمت کا نقش جم گیا۔ گاندھی جی کی کوششوں سے کچھ ریاستوں میں بنیادی تعلیم کا تجربہ بھی ہوا، مگر ایک طرف کچھ گاندھی وادیوں کے کٹر پن اور دوسری طرف ریاستی حکومتوں کے دفتری نظام کی وجہ سے بنیادی تعلیم کا تجربہ کامیاب نہ ہوسکا۔ ہاں جامعہ میں ذاکر صاحب نے اس کا خاصا کامیاب تجربہ کیا تھا۔

جامعہ کو چلانے اور اس کے لیے چندہ جمع کرنے اور اس کی نئی عمارتیں تعمیر کرانے میں ذاکر صاحب کا خاصا وقت صرف ہوتا تھا، مگر وہ پھر بھی تعلیمی اور ادبی مباحث پر مضامین لکھنے کے لیے وقت نکال ہی لیتے تھے۔ علی گڑھ یونیورسٹی کی اگزکٹو کونسل کے جلسوں میں بھی شریک ہوتے تھے اور ہر اچھے کام میں نہایت جوش و خروش سے مدد کرتے تھے۔ اس زمانے میں انھوں نے کاشی ودیاپیٹھ کے جلسہ تقسیم اسناد میں خطبہ دیا جو تعلیمی خطبات میں شامل ہے۔ یہ خطبہ اس وجہ سے بھی اہم ہے کہ اس میں ایک طرف ہندوستانی مسلمانوں کو قومی جدوجہد میں شریک ہونے کا مشورہ دیا گیا ہے دوسری طرف ارباب فکر کو توجہ دلائی گئی ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی تہذیبی و مذہبی خصوصیات کو برقرار رکھنا سبھی ہندوستانیوں کا فرض ہے کیونکہ چمن کی بہار تمام رنگوں کے پھولوں سے ہے صرف ایک طرح کے پھولوں سے نہیں۔

ذاکر صاحب کہتے وقت نہ تو جھجکتے تھے نہ بلاوجہ گرجتے تھے۔ وہ صاف، واضح، دلنشیں انداز میں بھرپور بات کہہ دیتے اور اس کا اثر بہت سی شاندار اور مرصع تقریروں سے زیادہ ہوتا کیونکہ ان میں منطق بھی ہوتی تھی اور حقیقت بھی اور تاثیر بھی۔

جب دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی ہے تو ذاکر صاحب جرمنی میں تھے۔ بڑی مشکل سے کسی طرح سوئٹزرلینڈ پہنچے اور وہاں سے اٹلی ہوتے ہوئے کئی ہفتے کے بعد ہندوستان واپس آئے۔ ان کے بعافیت واپس آجانے پر ان کے احباب کی طرف سے علی گڑھ میں ایک جلسہ ہوا تھا جس میں میں نے ایک نظم "مرد درویش" کے عنوان سے پڑھی تھی اس کے چند شعر شاید دلچسپی سے خالی نہ ہوں ؎

زمانہ جس کی تلاش میں تھا، یہی ہے ہمدم وہ مرد دانا
نگاہ جس کی ہے عارفانہ مزاج جس کا قلندرانہ

وہ جس کا دستور حق پسندی، وہ جس کا آئین دردمندی
وہ جس کے ایثار بے کراں کا ہے منتظر آج تک زمانہ

جلال بھی ہے جمال بھی ہے، یہ شخصیت کا کمال کہیے
خیال میں بجلیاں پرافشاں، لبوں پہ اک دلربا ترانہ

سکوت ساحل سے کون دیکھے، کنار ساحل سے کون سمجھے
کسی کا موجوں سے جنگ کرنا، کسی کا طوفاں کو آزمانا

یہ بزم ابھی آشنا نہیں ہے، جگر ابھی خوں ہوا نہیں ہے
ابھی مغنی نے ہلکے ہلکے سروں میں چھیڑا ہے اک ترانہ

ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مرد درویش جس کو حق نے دیے ہیں انداز خسروانہ؟

(اقبال)

نومبر ۱۹۴۶ء میں جامعہ کی جوبلی ہوئی۔ لکھنؤ سے میں بھی شرکت کے لیے گیا۔ اس وقت دہلی میں فرقہ وارانہ فسادات ہو رہے تھے مگر جوبلی پروگرام کے مطابق ہوئی۔ اس زمانے میں مسلمانوں میں لیگ کا اثر بہت زوروں پر تھا۔ جامعہ کے بہت سے استادوں اور طلبہ نے خواہش ظاہر کی کہ جہاں مولانا ابوالکلام آزاد جواہر لال نہرو اور راج گوپال آچاری کو بلایا جا رہا ہے جناح صاحب اور لیاقت علی خاں کو بھی دعوت دی جائے۔ ذاکر صاحب اور جامعہ پر یہ الزام عائد کیا جاتا تھا کہ یہ ادارہ کانگریس کے زیر اثر ہے اور مسلمانوں کے ایک بڑے طبقے کے جذبات کا پاس نہیں کرتا۔ جوبلی کا اجتماع تو ایک تعلیمی اجتماع تھا کوئی سیاسی کاروبار نہ تھا۔ ذاکر صاحب جناح صاحب کے پاس گئے اور ان سے درخواست کی کہ آپ بھی ہمارے جلسے میں تشریف لائیں اور تقریر کریں۔ جناح صاحب نے پہلے ذاکر صاحب کو طعنہ دیا کہ آپ جیسے ممتاز ماہر تعلیم لیگ سے علیحدہ کیوں ہیں۔ پھر یہ پوچھا کہ آپ نے جامعہ کی بستی کا نام جامعہ نگر کیوں رکھا۔ ذاکر صاحب نے جواب دیا کہ میرا میدان سیاست نہیں تعلیم ہے اور جامعہ نگر کا جواز یہ ہے کہ ہندوستان میں جب مسلمان آئے تو انھوں نے احمد نگر جیسے شہر آباد کیے۔ بہر حال جناح صاحب شرکت پر آمادہ ہو گئے اور راج گوپال آچاری کے ساتھ انھوں نے بھی جوبلی کے خاص جلسے میں تقریر کی۔ اس موقع پر ذاکر صاحب نے جس درد بھری آواز میں جامعہ کی روداد سنائی اس نے بہتوں کو رلا دیا۔ انھوں نے آخر میں ملک کے سیاست دانوں سے اپیل بھی کی کہ ملک میں آگ لگی ہوئی ہے۔ اس وقت یہ دیکھنے کا وقت نہیں ہے کہ آگ کس نے لگائی۔ اس وقت تو سب کو آگ بجھانے

پر مستعد ہو جانا چاہیے انھوں نے سیاست اور تعلیم کے کام کا فرق واضح کیا اور کہا کہ سیاست جلد باز ہوتی ہے، تعلیم کا کام صبر چاہتا ہے۔ سیاست جلد سے جلد مقصد کے حصول سے غرض رکھتی ہے تعلیم ذرائع کی پاکیزگی کو دیکھتی ہے۔ یہ خطبہ ذاکر صاحب کے معرکتہ الآرا خطبوں میں سے ہے۔

جوبلی بہت اچھی ہوئی۔ اس کے انتظامات بہت صاف ستھرے تھے۔ سارے کاموں میں جامعہ کے رفیقوں کے علاوہ کرنل بشیر حسین زیدی، چیف منسٹر رام پور اور ان کی بیگم قدسیہ زیدی اور رام پور کی ریاست کی پوری مدد شامل تھی۔ ملک بھر سے دانش ور، ماہرین تعلیم، ادیب، شاعر، سائنس داں، سیاسی رہنما، معلم سبھی اس میں شریک ہوئے تھے۔ سبھی جامعہ کے رول اور ذاکر صاحب کی عظیم شخصیت کا ایک گہرا اور مٹھا نقش لے کر گئے۔

ذاکر صاحب ہندوستان کی تقسیم کے خلاف تھے۔ گاندھی جی اور مولانا آزاد بھی اس کے خلاف تھے۔ مگر تقسیم ہو کر رہی۔ جولائی، ۱۹۴۷ء کے شروع میں کچھ دن کے لیے میں دہلی گیا۔ قرول باغ میں قیام تھا۔ ایک دن ذاکر صاحب اور شفیق الرحمٰن قدوائی کے ساتھ جامعہ میں گزارا۔ پنجاب سے جو شرنارتھی دہلی آ گئے تھے ان میں اپنا وطن چھوڑنے پر بڑا غم و غصہ تھا۔ دہلی کی فضا میں بڑی بے چینی تھی۔ جامعہ سے ایک بس میں گھنٹہ گھر پہنچا وہاں سے دوسری بس قرول باغ کے لیے لی۔ بس کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ ایک سپاہی بغیر ٹکٹ خریدے اس میں سوار ہو گیا۔ مسافر زیادہ پنجابی ہندو تھے۔ اسے گالیاں دے رہے تھے اور لڑنے کو آمادہ تھے۔ میں نے نرمی سے کہا، بھائی جانے دو کیوں جھگڑا کرتے ہو۔ وہ لوگ میرے سر ہو گئے۔ چونکہ میں قمیص پتلون پہنے ہوئے تھا اس لیے شاید مجھے بھی وہ ہندو سمجھے۔ کہنے لگے اسی نرمی نے ہم سے ہمارا وطن چھڑا دیا۔ ہم تو اس سپاہی کو ماریں گے اور تم بولو گے تو تمھیں بھی۔ میں خاموش ہو گیا۔ اس ایک لمحے میں مجھے احساس ہوا کہ فسادات کا کیسا بھیانک سایہ ہمارے سر پر منڈلا رہا ہے۔ دوسرے دن ہی میں اپنے گھر واپس آ گیا۔

ذاکر صاحب اس زمانے میں بہت پریشان تھے مگر یہ طے کیے بیٹھے تھے کہ اپنی جگہ سے نہیں ہلیں گے جولائی گزرا۔ اگست آیا۔ پندرہ اگست کو ملک آزاد ہوا۔ جواہر لال نہرو نے اپنی تاریخی تقریر کی۔ آزادی کا نشہ ہم سب پر ابھی آنے نہ پایا تھا کہ فسادات کی شدت اور بربریت نے دہلا دیا۔ نہ معلوم کیسے ذاکر صاحب نے جو بہت تھک گئے تھے، کچھ دن کشمیر میں گزارنے کی ٹھانی۔ دہلی سے چلے تو جالندھر کے ایک مسلمان وکیل جو ان کے پرانے جاننے والے تھے ساتھ ہو گئے۔ انھوں نے اصرار کیا کہ جالندھر دو ایک دن ٹھہرتے ہوئے کشمیر جائیے۔ یہ راضی ہو گئے۔ راستے میں کسی دوسرے ڈبے سے ایک ہندو جس نے پہلے کہیں ذاکر صاحب کو دیکھا تھا ان سے ملنے آیا۔ کچھ دیر اس سے باتیں کرتے رہے۔ جالندھر کے اسٹیشن پہ اترے تو دیکھا کہ فوج

رائفلیں لیے پلیٹ فارم پر موجود ہے، قلیوں کا پتہ نہیں اور کچھ والنٹیر جو سیوا سمتی کے معلوم ہوتے تھے مسافروں کا سامان جلدی جلدی اٹھا کر انھیں ساتھ لیے جا رہے ہیں۔ ذاکر صاحب کا سامان بھی ان لوگوں نے اٹھانا چاہا، مگر ان کے ساتھی وکیل نے انھیں ڈانٹ دیا۔ اس پر فوجیوں نے رائفلیں تان لیں، مجبوراً ذاکر صاحب، ان کے وکیل ساتھی ان والنٹیروں کے گھیرے میں روانہ ہوئے۔ راستے میں اسٹیشن ماسٹر کا دفتر پڑا اس کے قریب وہ ہندو نظر آیا جو رات کو ریل میں ذاکر صاحب سے ملا تھا۔ اس نے انھیں بتایا کہ والنٹیروں کے ساتھ جانے میں خطرہ ہے۔ آپ لوگ اسٹیشن ماسٹر کے دفتر میں گھس جائیے، یہ لوگ دفتر میں پہنچے تو اسٹیشن ماسٹر نے انھیں چلتا کرنا چاہا کیونکہ باہر سے والنٹیر کڑی نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ اس ہندو نے ان لوگوں سے کہا کہ آپ اسٹیشن ماسٹر کا آفس نہ چھوڑیے گا اور خود بھاگا بھاگا گیا اور فوج کے ایک سکھ افسر کو بلا لیا۔ اسے بتایا کہ ذاکر صاحب گاندھی جی اور جواہر لال نہرو کے دوست ہیں اور انھیں ہر حال میں بچانا ہے۔ اس سکھ افسر نے آ کر ان دونوں کو اپنی حفاظت میں لیا، ہجوم کو منتشر کیا اور ذاکر صاحب کو حفاظت کی ایک جگہ پہنچا دیا۔ جب وہاں بھی خطرہ پیدا ہوا تو دوسرے دن مسلح گارد کے ساتھ انھیں دہلی بھیج دیا۔

ذاکر صاحب واپس آئے تھے کہ دہلی میں بڑے پیمانے پر فسادات شروع ہو گئے۔ قرول باغ میں مکتبۂ جامعہ کے گودام کو آگ لگا دی گئی۔ جامعہ کی بستی کو ہر طرف سے خطرہ تھا۔ جواہر لال نہرو خود آئے اور جامعہ والوں کی حفاظت کا بندوبست کیا۔ ذاکر صاحب نے اس زمانے میں ایک سردار کی طرح دن رات حفاظتی تدابیر میں صرف کر دیے۔ ساتھیوں کی ڈھارس بندھائی۔ آس پاس کے گاؤں والوں سے رابطہ قائم کیا۔ خورونوش کا سامان فراہم کیا اور جب جامعہ کی طرف سے کچھ اطمینان ہوا تو شہر کے ان مسلمانوں کو جو خطرے میں گھرے ہوئے تھے، ہمایوں کے مقبرے کے کیمپ میں پہنچایا اور ان کے کھانے پینے اور حفاظت کا انتظام کیا۔ اس زمانے میں ذاکر صاحب رات گئے تک دہلی کی سڑکوں پر ایک جیپ میں اپنی سلامتی سے بے پروا پھرا کرتے تھے۔ جواہر لال نہرو کو معلوم ہوا تو انھوں نے ان کے ساتھ ایک سپاہی کر دیا۔

۱۹۴۸ء میں مولانا آزاد نے یہ محسوس کیا کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی حالت نازک ہے۔ نواب اسماعیل خاں اس وقت وائس چانسلر تھے مگر چونکہ وہ مسلم لیگ کے لیڈروں میں سے تھے اس لیے حکام اور شہر کی اکثریت انھیں شبہے کی نظر سے دیکھتی تھی۔ انھوں نے نواب صاحب کو آمادہ کیا کہ وہ استعفیٰ دے دیں اور ذاکر صاحب کا انتخاب کرایا۔ ذاکر صاحب علی گڑھ کو خطرے میں دیکھ کر اس کی خدمت کے لیے تیار ہو گئے۔ ان کی صرف ایک شرط تھی کہ ان کا انتخاب بلا مقابلہ ہو، یہ شرط پوری ہوئی اور آخر ۱۹۴۸ء میں ذاکر صاحب علی گڑھ آ گئے۔

ذاکر صاحب تقریباً آٹھ سال علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے۔ انھوں نے جب وائس چانسلری

کا عہدہ سنبھالا تو یونیورسٹی کی حالت خاصی نازک تھی۔ بہت سے اساتذہ پاکستان چلے گئے تھے۔ طلبہ کی تعداد بھی خاصی کم ہوگئی تھی۔ شہر کے ہندو، یونیورسٹی سے بدظن تھے۔ علی گڑھ کے اساتذہ اور طلبہ کی اکثریت نے چونکہ پاکستان بنوانے کی تحریک میں بڑی سرگرمی سے حصہ لیا تھا اس لیے ملک میں بھی یونیورسٹی کے خلاف خاصی ناراضگی تھی۔ ذاکر صاحب نے قومی رہنماؤں سے رابطہ قائم کیا۔ راج گوپال آچاریہ اور جواہر لال نہرو کو بلایا۔ شہر کے معقول اور سنجیدہ لوگوں سے ملے۔ اساتذہ کو ڈھارس دی۔ طلبہ سے بات چیت کی۔ قومی زندگی سے ہم آہنگ ہونے اور قومی تصور کو اپنانے پر زور دیا۔ ساتھ ہی یونیورسٹی کی صالح روایات اور اس کے مخصوص رول کی اہمیت پر بھی اصرار کیا۔ اپنی تقریروں اور خطبوں میں بار بار علی گڑھ کو قومیت اور انسانیت کے فرائض یاد دلاتے اور ملک و قوم کو علی گڑھ کے رول کو پہچاننے اور اس کی قدر کرنے کی طرف مائل کیا۔ اساتذہ کو علمی کاموں کی طرف راغب کیا۔ طلبہ کو پڑھنے پڑھانے کے علاوہ اقامتی زندگی کے دوسرے اہم پہلوؤں، تہذیبی سرگرمیوں اور فنون لطیفہ کے ذوق سے آشنا کیا۔ علی گڑھ کی ویران، گرد آلود، میلی مٹیالی دنیا کو ہرے بھرے میدانوں اور رنگ برنگ کے پھولوں سے بھر دیا۔ باہر سے اچھے اچھے استاد لائے۔ یہاں کے اچھے استادوں کو ترقی دی۔ تصنیف و تالیف سے شغف کی طرف مائل کیا۔ کورٹ میں اس وقت تک صرف مسلمان ہی ممبر ہو سکتے تھے اور وائس چانسلر کا انتخاب بھی کورٹ کرتا تھا۔ ۱۹۵۲ء کے ایکٹ کے بعد سے یونیورسٹی کے کورٹ میں غیر مسلم بھی منتخب ہونے لگے اور وائس چانسلر کا انتخاب اگزیکٹو کونسل کرنے لگی۔ اس زمانے میں علی گڑھ کو اس کا کھویا ہوا وقار واپس مل گیا اور علمی دنیا میں اس کا نام بھی آنے لگا۔ جب نیا ایکٹ بنا تو میں لکھنؤ میں تھا۔ میں نے ذاکر صاحب کو خطاب کر کے ایک نظم لکھی تھی۔ اس کے چند شعر یہاں بے موقع نہ ہوں گے ؎

اے کہ کرنوں سے تری اپنے سیہ خانے میں	چاند کا نور ستاروں کی چمک باقی ہے
لالہ کاری سے تری باد خزاں کے باوصف	اپنے ویرانے میں پھولوں کی مہک باقی ہے
یہ تری تلخ نوائی ہے کہ دیوانوں میں	اپنی منزل پہ پہنچنے کی للک باقی ہے
کون سمجھے ترے پرسوز تخیل کے سوا	اب بھی بربناب میں شعلوں کی لپک باقی ہے

یہ لہو جس میں تب و تاب نفس سے تیرے	دیکھ ایوان حکومت میں چراغاں نہ بنے
اگر [illegible]	شعلہ اپنا بھی چراغ تہ داماں نہ بنے
[illegible]	کسی گلزار کی اک جوئے خراماں نہ بنے

ہند کے جلوۂ صد رنگ کا ہے پاس ضرور		اس میں سوزِ عرب و حسنِ عجم یاد رہے
کارواں منزلِ نو کے لیے ہو گرمِ سفر		اپنی تہذیب کا بھی نقشِ قدم یاد رہے
چمنِ علم و ادب میں نئی کلیوں کے حضور		میر و غالب کے شگوفوں کا بھرم یاد رہے

درِ مے خانہ ہر اک رند پہ اب باز رہے
پینے والوں کا مگر پھر بھی اک انداز رہے

ذاکر صاحب نے علی گڑھ میں یہی کیا۔ درِ مے خانہ سب کے لیے کھول: یا مگر پینے والوں کے ایک انداز پر اصرار کیا۔ تنگ نظر یا انتہا پسند حضرات کو ممکن ہے اس میں تضاد نظر آئے یا اسے وہ فریب سمجھیں مگر دراصل ذاکر صاحب کا نقطۂ نظر بالکل صحیح تھا۔ سیکولر ہندوستان میں علی گڑھ کے دروازے سب کے لیے کھلے ہونے ضروری تھے، مگر یہ بھی ضروری تھا کہ علی گڑھ اپنے مخصوص رول کو ملحوظ رکھے اور اپنی مذہبی علمی، تہذیبی و ادبی خصوصیات پر خود بھی فخر کرے اور ملک و قوم کو بھی فخر کرنا سکھائے۔ خرابیٔ صحت نے ذاکر صاحب کو ۱۹۵۶ء میں علی گڑھ چھوڑنے پر مجبور کیا، مگر وہ علی گڑھ کو آزاد ہندوستان میں اپنے لیے ایک باعزت جگہ بنانے کا راستہ بتا چکے تھے۔ آزاد ہندوستان نے بھی علی گڑھ کو دل سے قبول کر لیا تھا۔ گویا علی گڑھ میں ان کا کام پورا ہو چکا تھا۔ خدمت کا دور ختم ہو چکا تھا۔ اب حکومت کا دور شروع ہونے والا تھا۔

ذاکر صاحب نے ستمبر ۱۹۵۶ء میں علی گڑھ چھوڑا۔ کچھ دن جامعہ میں آرام کرنے کے بعد یونیسکو کی ایک کانفرنس میں شرکت کرنے یورپ گئے۔ وہ وہیں تھے کہ ان کی منظوری لینے کے بعد اخباروں میں ان کی بہار کی گورنری کا اعلان ہوا۔ جولائی ۱۹۵۷ء میں انھوں نے اس عہدے کا چارج لیا۔ گورنر کا عہدہ عجب ہے۔ اب اس کے اختیارات بہت کم ہیں مگر شان بہت زیادہ ہے۔ ذاکر صاحب کا بہت سا وقت دوروں میں، ملاقاتوں میں، وزیروں سے بات چیت میں اور دوسرے منصبی کاموں میں صرف ہوتا تھا۔ مگر اس زمانے میں انھوں نے اپنے افلاطون کی ریاست کے ترجمے پر نظرِ ثانی کی۔ مولانا آزاد کے ترجمان القرآن کی ان دو جلدوں کا مسودہ دیکھا جو اجمل خاں نے تیار کیا تھا، شاد کی کہانی شاد کی زبانی کا مسودہ پڑھ کر اس کی اشاعت کی طرف سے مجھے توجہ دلائی۔ دیسنہ کا کتب خانہ، خدا بخش لائبریری منتقل کرایا۔ پٹنہ یونیورسٹی اور بہار یونیورسٹی میں علمی فضا پیدا کرنے کے لیے اقدامات کیے۔ غرض علمی و ادبی کاموں میں خاصا وقت صرف کیا اور ادیبوں اور عالموں کی ہر طرح ہمت افزائی کی۔ خود ان کا اپنا مطالعہ برابر جاری رہا تعلیم، اقتصادیات، عالمی ادب، حالاتِ حاضرہ، مذہبیات پہ ہر اہم کتاب پڑھنے کے لیے وہ کسی نہ کسی طرح وقت نکالتے تھے۔ اردو میں بھی نئی کتابوں کا بڑے شوق سے مطالعہ کرتے تھے اور انگریزی کے اہم رسالے

برابر دیکھتے تھے، دوستوں کے خطوط کا جواب اس زمانے میں بھی وہ زیادہ تر خود ہی لکھتے تھے۔ ٹائپ شدہ خطوط کا سلسلہ تو بعد میں شروع ہوا۔ ذاکر صاحب تقریر کرنے سے گھبراتے تھے مگر انھیں بہت تقریریں کرنی پڑتی تھیں اور عام طور پر لوگ ان کے مغز اور ان کے اسلوب دونوں سے متاثر ہوتے تھے۔ یہ کہنا مشکل ہوگا کہ ان کی اردو کی تقریر بہتر ہوتی یا انگریزی کی۔ دونوں میں ہیرے کی طرح ترشے ہوئے خیالات گہری بصیرت حکیمانہ نظر اور حسن کاری کا گہرا نقش ہوتا تھا۔ ویسے مجھے ان کی اردو کی تقریریں اور تحریریں زیادہ پسند ہیں۔ ان میں ان کی شخصیت کی گرمی، ان کے "دنوں کی تپش" اور ان کی "شبوں کا گداز" زیادہ نمایاں ہے۔

فروری ۱۹۵۸ء میں مولانا آزاد کا انتقال ہوا۔ ذاکر صاحب نے دہلی کے تعزیتی جلسے میں جو تقریر کی اس کا اثر میں اپنی آنکھوں سے جواہر لال نہرو، کرشنا مینن اور پی۔ این سپرو جیسے حضرات پر دیکھ رہا تھا۔ انھوں نے مولانا کے ان اثرات کا ذکر کیا جو ان کی اپنی شخصیت پر پڑے تھے۔ پھر نہایت صفائی سے آخر زمانے کے ان سے اختلاف کا بھی ذکر کیا۔ مولانا کی اعلیٰ ظرفی کی شہادت دیتے ہوئے انھوں نے اپنی عالی ظرفی بھی ظاہر کر دی۔ اس زمانے میں عام خیال تھا کہ مولانا کا جانشین ذاکر صاحب سے بہتر نہ ملے گا۔ سنا ہے کہ پنڈت نہرو کو اس کا خیال آیا تھا مگر پنت جی نے اپنی حکمت عملی سے ذاکر صاحب کی صحت کی خرابی کا تذکرہ چھیڑ کر حافظ ابراہیم صاحب کے لیے مرکزی وزارت میں جگہ نکال لی۔ اگر ذاکر صاحب مولانا کے بعد ہمارے وزیر تعلیم ہو جاتے تو ملک کی تعلیمی فضا شاید کچھ اور ہوتی۔

ڈاکٹر رادھا کرشنن جب ۱۹۶۲ء میں صدر جمہوریہ ہوئے تو میں انھیں مبارکباد دینے گیا۔ اس وقت یہ طے ہو چکا تھا کہ ان کی جگہ ذاکر صاحب کو نائب صدر بنایا جائے گا۔ رادھا کرشنن نے مجھ سے بیان کیا کہ نہرو اور شاستری نائب صدر کی جگہ کے سلسلے میں ان سے مشورہ کرنے آئے تھے۔ شاستری نے مسز پنڈت کا نام پیش کیا جس کی رادھا کرشنن نے اس وجہ سے مخالفت کی کہ وزیر اعظم کی بہن کو نائب صدر نہیں بنانا چاہیے۔ پنڈت نہرو نے رادھا کرشنن کی رائے سے اتفاق کیا اور ان سے پوچھا کہ ذاکر حسین کیسے رہیں گے۔ رادھا کرشنن نے نہایت گرمجوشی سے تائید کی اور کہا کہ وہ ہر لحاظ سے اس عہدے کے لیے موزوں ہیں۔ اس وقت تک کانگریس کی اکثریت اتنی نمایاں تھی کہ صدر اور نائب صدر کے عہدے کے لیے صرف جواہر لال نہرو کو طے کرنا ہوتا تھا ضابطہ کی کارروائی بعد میں ہوتی رہتی تھی۔

ذاکر صاحب کو باغبانی سے شروع سے دلچسپی تھی۔ علی گڑھ کو انھوں نے گلزار کر دیا تھا۔ پٹنے کے راج بھون میں لالہ کاری اور تازہ کاری کی۔ جب دہلی آئے تو مولانا آزاد روڈ کے باغ میں گلابوں کی ساری اچھی قسمیں جمع کر لیں۔ ناگ پھنی سے بھی کافی دلچسپی تھی۔ یہیں انھیں قسم قسم کے پتھر جمع کرنے

کا شوق ہوا، اور جب لوگوں کو ان کے اس شوق کا علم ہوا تو تحفے میں ساری دنیا سے عجیب عجیب قسم کے پتھر اور مونگے آنے لگے۔ جو بھی ان سے ملنے جاتا تھا اسے ڈرائنگ روم میں گجرال کا تازہ شاہکار اور چند نادر وصلیاں، باغوں میں رنگ برنگ کے پھول اور ایک کمرے میں عجیب عجیب پتھر دیکھ کر ذاکر صاحب کے جمالیاتی ذوق کی گہرائی اور گیرائی دونوں کا احساس ہو جاتا۔ پانچ برس میں انھوں نے بیرونی ملکوں کے بہت سے دورے کیے اور ہر طرح کے مدبروں، دانش وروں اور عالموں سے ملے۔ وہ جہاں گئے، اپنی علمیت، اپنی پاکیزہ شخصیت، اپنی دلنوازی، اپنی وسیع المشربی، اپنی انسان دوستی کا لازوال نقش چھوڑا۔ جب ۱۹۶۷ء کے عام چناؤ کے بعد صدر جمہوریہ کے انتخاب کا سوال پیدا ہوا تو اندرا گاندھی نے ذاکر صاحب کا نام تجویز کیا چونکہ کانگریس کی اکثریت اس وقت بہت کم رہ گئی تھی اور مخالف پارٹیوں کے حوصلے بڑھے ہوئے تھے اس لیے یہ خطرہ تھا کہ کہیں ذاکر صاحب کو کچھ کانگریس والے ہی ووٹ نہ دیں، مگر ذاکر صاحب کو نمایاں کامیابی ہوئی اور مخالف پارٹیوں کے کچھ لوگوں نے بھی انھیں ووٹ دیے۔ ذاکر صاحب کی کامیابی سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ سیکولرزم کی بنیاد بہر حال مستحکم ہے۔ سیکولرزم کے یہ معنی نہیں کہ مسلمان کو صدر بنا کر سیکولرزم کا ثبوت دنیا کو دیا جائے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ بہترین صلاحیت رکھنے والا شخص چنا جائے خواہ وہ کسی مذہب سے تعلق رکھتا ہو ذاکر صاحب اس لیے صدر ہوئے کہ وہ موزوں ترین آدمی تھے اور ان کا مسلمان ہونا ان کے انتخاب میں حارج نہ ہوا۔ جب ۱۹۶۵ء میں ہندوستان اور پاکستان میں جنگ چھڑی تھی تو جن سنگھ نے ذاکر صاحب کے خلاف بھی ایک ناپاک مہم چلائی تھی اور صدارت کے انتخاب کے وقت بھی، مگر جن سنگھ ہندوستان کے ضمیر کو متزلزل نہ کر سکا اور ذاکر صاحب نے دو برس میں ہی ایسی روایات قائم کیں کہ جو لوگ ان کے انتخاب پر سر کرداں تھے وہ بھی ان کی موت پر دلی رنج و غم کا اظہار کر رہے تھے۔

ذاکر صاحب دو سال سے کم ہی صدر رہے، مگر اس زمانے میں بھی انھوں نے صدر کے عہدے کی شان اور بڑھا دی۔ ان کے پیش رو کوئی معمولی آدمی نہ تھے۔ ڈاکٹر راجندر پرشاد اور ڈاکٹر رادھا کرشنن نے اس عہدے کو خاصا وزن اور وقار عطا کیا تھا۔ ذاکر صاحب نے صدر ہونے کے بعد کہا تھا کہ ان کا انتخاب ایک معلم کی خدمات کا اعتراف ہے۔ واقعی وہ ساری عمر ایک معلم رہے۔ انھوں نے طالب علموں کو افکار و اقدار اور کردار کی دولت سے مالا مال کیا۔ انھوں نے استادوں کو علم کی لگن اور خدمت کی دُھن دی، انھوں نے سیاست دانوں کو اخلاق سکھایا۔ انھوں نے عوام کو محنت اور خدمت کی تلقین

کی۔ انھوں نے اپنے عمل سے دکھا دیا کہ وطن کی محبت اور قوم کے دکھ درد میں شرکت اور سماج کی فلاح کے لیے جد و جہد کس طرح بالآخر سب کے دلوں کو موہ لیتی ہے۔ خادم کس طرح مخدوم بنتا ہے۔ عاشق کیوں محبوب ہوتا ہے۔ عارف کیوں رہنما مان لیا جاتا ہے۔ وہ بڑے اچھے مسلمان تھے، مگر ان کا اسلام سکڑا سہما، اپنے خول میں بند، تازہ ہواؤں اور نئے خیالات سے خائف اسلام نہ تھا۔ یہ اپنے ایمان میں مضبوط اپنے عقائد میں پختہ، اپنی خصوصیات پر مضبوطی سے جما ہوا اسلام تھا، جو سب کے لیے اور سب کا تھا یہ اسلام اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنانے کے بجائے دنیا میں اسلامی اقدار اور اسلامی کردار کے اثرات کو عام کرنے والا اسلام تھا، اس میں تمام مذاہب کا احترام تھا۔ ان کے ماننے کا سوال نہ تھا۔ اس میں انکسار تھا کسی ملّا کی رعونت یا جارحیت نہ تھی۔ اس میں قدیم تہذیب، قدیم روایات کا احساس تھا، ان کی اندھی پرستش نہ تھی۔ اس میں ہماری مشترک تہذیب کی ساری رعنائی و زیبائی جھلکتی تھی۔ اس میں نفاست تھی، حسن تھا، مروت تھی، شرافت تھی، فرد کی شخصیت کا احترام تھا، لیکن اسے سماجی مقاصد سے ہم آہنگ رکھنے کا عزم۔ ایسی شخصیتیں صدیوں میں پیدا ہوتی ہیں اور مر کر بھی زندہ رہتی ہیں۔ ذاکر صاحب نے کتنوں کو اپنی منزل متعین کرنے میں مدد دی، کتنوں کو آدمی بنایا، کتنے دیے جلائے، کتنے پھول کھلائے، کتنے دل جوڑے، کتنے دلوں سے زنگ دور کیا، کتنوں کو نظر دی، کتنوں کو جینا سکھایا۔ کمزوریاں ان میں بھی تھیں، وہ آدمی تھے، فرشتہ نہ تھے۔ انھیں کوئی دھوکا نہیں دے سکتا تھا۔ وہ ہر ایک کی ذات پہچان لیتے تھے مگر مروت کی وجہ سے اس پر ظاہر نہ ہونے دیتے تھے۔ انھوں نے جب کسی کے سر پر ہاتھ رکھ دیا تو پھر ہر حال میں اس کا ساتھ دیا۔

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ان کے انجام سے ان کا آغاز زیادہ شاندار تھا۔ وہ ان کے خدمت کے دور کو دیکھتے ہیں ان کے حکومت کے دور کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ حالانکہ دونوں میں ایک وحدت ہے۔ ذاکر صاحب کی طرح جو بھی ملک و قوم اور انسانیت کی خدمت کرے قوم اسے سر آنکھوں پر بٹھائے گی۔ صدارت ان کی زندگی کی تکمیل کرتی ہے، بذاتِ خود اس کی اہمیت نہیں۔ یہ صرف اس بات کی علامت ہے کہ خلوص اور خدمت بالآخر اپنا رنگ دکھاتے ہیں اور محبوبیت و مقبولیت کے جو مظاہر ہیں ان میں ایک ہندستان کے پہلے شہری کے عہدے کا بھی ہے۔

ذاکر صاحب تمام ہندوستانیوں کے لیے عموماً اور ہندوستانی مسلمانوں کے لیے خصوصاً جینے کا ایک ڈھنگ اور عاشقی کے کچھ آداب دے گئے ہیں۔ انھیں برتنا ہی ان کی گراں قدر خدمات کا سب سے اچھا اور سچا اعتراف ہوگا۔ کاش ہم اس کا ثبوت دے سکیں۔

خراجِ عقیدت

از

(احمد سعید خاں صاحب، نواب چھتاری)

علی گڑھ
راحت منزل
۸ جون ۶۹ء

محبی و مخلصی

آپ نے اپنے گشتی خط میں یہ خواہش ظاہر کی ہے کہ ڈاکٹر ذاکر صاحب مرحوم کے متعلق اپنے تاثرات لکھوں۔ کیا لکھوں۔ اب بھی جبکہ وہ اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں کسی معاملے میں الجھن ہوتی ہے تو بے ساختہ یہ خیال آتا ہے کہ ذاکر صاحب سے مشورہ کر لوں گا۔ اس کا یقین ہی نہیں آتا کہ ہمیشہ کے لیے مفارقت ہو چکی ہے خدا ان کو اپنی رحمتوں سے نوازے۔

مرحوم کے جامع حیثیات ہونے کا تو سارا ملک قائل ہے۔ لاتعداد مقالے اور مضامین لکھے جا چکے ہیں لیکن مجھے ان کی صفاتِ اعلیٰ میں جن صفات نے سب سے زیادہ متاثر کیا اور جو رہ رہ کر یاد آتی ہیں وہ ان کا اخلاق، انکسار اور شرافت نفس ہیں۔

تقریباً چالیس سال سے کچھ زیادہ دنوں سے اُن سے شرف نیاز حاصل تھا اور میں نے انھیں زندگی کے سارے مدارج طے کرتے دیکھا۔ میں نے انھیں وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ کی حیثیت سے دیکھا، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی حیثیت سے نہ صرف دیکھا بلکہ اُن کے شریک کار کی حیثیت سے اس زمانہ میں جب اس یونیورسٹی کی کشتی بادِ مخالف کے تھپیڑے کھا رہی تھی مرحوم نے اس ادارے کی جو خدمت کی وہ بھی دیکھا۔ یہ مرحوم ہی کا تدبر اور اخلاص تھا جس نے کشتی کو بچایا۔

میں نے ان کو گورنر کے منصب پر فائز دیکھا، وائس پریسیڈنٹ اور اس کے بعد بحیثیت ہندوستان کے پریسیڈنٹ کے دیکھا۔ جس قدر وہ ترقی کے مدارج طے کرتے تھے اسی قدر ان کے اخلاق، انکسار اور سادہ مزاجی میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ وہ جتنے بلند مناصب پر فائز ہوتے تھے اتنا ہی زیادہ جھکتے تھے۔

ایک بار میں پٹنہ میں ان کے پاس مقیم تھا۔ روز صبح کو میرے کمرے میں آتے اور نہ صرف مجھ سے بلکہ میرے بیٹے بن اور میرے ملازم سے بھی پوچھتے کہ آپ آرام سے ہیں بعض اوقات مرحوم کا یہ شفقت انکسار دوسرے شخص کو ذہنی الجھن میں مبتلا کر دیتا تھا۔ انھیں دنوں پٹنہ میں آل انڈیا بوائے اسکاؤٹ کا ایک جلسہ تھا۔ میں نے درخواست کی کہ وہ گورنر تھے اس کا افتتاح فرما دیں۔ انھوں نے اسے قبول فرما لیا۔ اور افتتاحی تقریر ان الفاظ سے شروع کی۔

SO HERE I AM, IN OBEDIENCE TO THE COMMAND OF THE NAWAB SAHIB OF CHHATARI, FROM WHOSE KINDNESS & WISDM I HAVE BENEFITTED GREATLY DURING THE LONG YEARS OF MY ASSOCIATION WITH HIM & WHOSE FRIENDSHIP I CHERISH AS ONE OF THE PRIZES OF MY LIFE.

کوئی بتائے جو وہ یوں کہیں تو کیا کہیے۔ ان کی عادت تھی کہ وائس پریسیڈنٹ کے عہد میں بھی جو ملاقاتی آتے انھیں موٹر تک پہنچانے ہمیں اس وقت اصرار بھی کرتا مگر نہ مانتے۔ جب پریسیڈنٹ ہوئے تو میں حاضر ہوا ملاقات کے بعد میرے ساتھ ساتھ زینے کے دروازے تک آ گئے۔ میں نے رخصت ہونا چاہا مگر ڈاکٹر صاحب مرحوم دروازہ کھول کر باہر آ گئے خیال ہوا کہ اب موٹر تک پہنچانے جائیں گے میں نے بالکل اضطراری حالت میں دونوں ہاتھوں سے روکتے ہوئے کہا خدا کے واسطے آپ آگے نہ آئیں، میری اضطراری کیفیت پر وہ بے ساختہ ہنس پڑے اور رخصت فرمایا میں گفتگو میں انھیں حضور والا کہہ کر مخاطب کر رہا تھا تو فرمانے لگے "بس بس رہنے دیجیے میں بُرا نا نہا نا منہ ہوں"

اتنے برسوں کے تعلقات کے زمانے میں کبھی کسی شخص کو بُرا کہتے میں نے نہیں دیکھا جن سے اختلاف رائے بھی ہوتا تھا مرحوم اُن کو بھی ہمیشہ اچھے الفاظ سے یاد کرتے۔ ان کی شرافت نفس اس کی اجازت نہیں دیتی تھی کہ کسی کے متعلق کوئی بُرا خیال قائم کریں۔

پرانے دوستوں سے جو تعلقات ہوتے تھے مرحوم اُن کا ہمیشہ لحاظ رکھتے تھے اور اسی طرح ملتے تھے جس طرح ہمیشہ ملتے رہے۔ کبھی اس کا احساس نہیں ہوتا تھا کہ مرحوم پریسیڈنٹ آف انڈیا ہیں اور کوئی فرق مرحوم اور ان کے دوست کے درمیان حائل ہے۔

ان کی وفات کا ماتم پوری قوم کا ماتم ہے۔ مگر ہم علی گڑھ والوں کے لیے تو
کل تم گئے کہ ہم پہ قیامت گزر گئی

اللہ تعالیٰ جوارِ رحمت میں جگہ دے!

آپ کا مخلص
احمد سعید

ڈاکٹر ذاکر حسین
ترجمہ : اصغر عباس

ابدیت یا کھلونا

(ڈاکٹر ذاکر حسین نے ۱۹۲۰ء میں علی گڑھ میگزین میں انگریزی میں یہ مضمون لکھا تھا۔ اس نمبر میں اس کا ترجمہ شائع کیا جا رہا ہے)

(ادارہ)

ازالۂ اوہام تکلیف دہ ہوتا ہے لیکن یہ عقل و دانش کا بہترین جوہر بھی ہے۔ ساری کامرانیوں کا انحصار اسی کے مختلف مراحل پر مبنی ہے۔ اور مستقبل کی تمام تر کوششیں ازالۂ اوہام کے اثر انداز ہونے کے تناسب میں ہی کامیابی سے ہمکنار ہوا کرتی ہیں لیکن اس کا حصول بہترین شکل میں اسی وقت ہو سکتا ہے جبکہ حقائق کا نصب العین سے موازنہ کیا جائے۔

لہٰذا یہ بے جا نہ ہو گا اگر ہم مدرسۃ العلوم کی ترقی کے اس مرحلہ پر پہنچ کر تھوڑی دیر کے لیے نصب العین اور حقائق پر غور کریں اور دونوں کا موازنہ کریں۔ مدرسۃ العلوم مسلمانان جلد ہی یونیورسٹی کی شکل میں تبدیل ہونے والا ہے اور اب ہم عنقریب ہی ایک بڑی جست لگانے والے ہیں اس لیے ہمیں سمت کا تعین سوچ سمجھ کر کرنا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہماری یہ جست ہمیں تاریکی کی طرف لے جائے۔

ہمارے لیے یہ مناسب ہو گا اگر ہم مدرسۃ العلوم مسلمانان کے آئیڈیل اور کام کی نوعیت کو مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کے لیے وسیع تر کوششوں کا جزو سمجھیں جس کا آغاز تقریباً ایک ہی ساتھ اسلامی دنیا کے مختلف حصوں میں ہوا۔ یہ ایک عام بات ہے کہ جن قوموں کے سامنے زندہ نصب العین ہوتا ہے اور دنیا کے لیے واضح پیغام یا دنیا کی تہذیبی ترقی میں اس کا حصہ ہوتا ہے ایسی قوم دائمی طور پر فنا نہیں ہو سکتی وہ موت کی غشی کی کیفیت سے تو گزر سکتی ہے اور زبوں و درماندہ معلوم ہونے لگتی ہے لیکن اس کی جڑوں میں زندگی کے آثار پنہاں ہوتے ہیں جو کہ کمزور اور دم توڑتے ہوئے وجود کو زندگی اور توانائی بخشتے رہتے ہیں۔

ملت اسلامیہ میں بھی زندہ رہنے کی یہ غیر فانی حرارت موجود ہے گو کہ وہ مشترکہ قومی انحطاط کا شکار ہوئی ہے اس کی مثال اس پودے کی سی ہے جو غربت کی ہوا میں لگا دیا گیا ہو اس میں پژمردگی کے آثار نمایاں ہونے لگیں لیکن اس میں یہ صلاحیت ہو کہ وہ بہت تیزی کے ساتھ زندگی کی تازہ دمی کو حاصل کر لے۔ اسی طرح ملت کا غیر فانی ہونا ان عقائد کی وجہ سے ہے جس پر اس کی بنیاد ہے لیکن اسی کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی صحیح ہے کہ دوسری زندہ چیزوں کی طرح یہ بھی انحطاط کا شکار ہوتی ہے۔

پچھلے سال پہلے ایسی ہی ابتری اور پژمردگی کا دور تھا جس سے اسلام گزرا۔ یہ شاید قومی بے حسی کی بدترین حالت تھی اور قومی روح اتنی مفلوج ہو گئی تھی جتنی اس سے قبل کبھی نہیں ہوئی۔ اس کا سیاسی ڈھانچہ کسی بھی فعال مقصد کے لیے بالکل ناکارہ ہو چکا تھا اور ایک ماہر طبیب ہی اس بات کا پتہ لگا سکتا تھا کہ اس میں زندگی کے آثار باقی بھی ہیں یا نہیں۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس میں ہمیشہ صحت مندانہ مدافعت کی قوت برقرار رہی۔ چنانچہ یہ قوت مختلف روپ میں ظاہر ہوتی رہی۔

عظیم مصلح اور مجدد عبد الوہاب نجدیؒ نے مذہبی نشاۃ ثانیہ کی بھرپور کوشش کی۔ ایک دوسرے سیاسی رہنما شیخ جمال الدین افغانی نے اسلامی ریاستوں میں سیاسی ہم آہنگی پیدا کرنا اپنا نصب العین بنایا جو متعصب یورپین سیاست دانوں کے نزدیک بے معنی چیز تھا اور اسے انھوں نے پین اسلام ازم کا غیر مناسب نام دیا۔ سرسید ہندوستان میں پیدا ہوئے، ان کی پرورش اس ہندوستانی فضا میں ہوئی جو نسبتاً سکون و اطمینان سے عبارت تھی۔ چنانچہ اول الذکر دونوں رہنماؤں کے برخلاف جنھوں نے انقلابی طور پر اپنا مقصد حاصل کرنے کی کوشش کی۔ سرسید نے انقلابی طریقہ کار کے برخلاف تدریجی ارتقا کا راستہ اختیار کیا اور انقلابی تحریکوں کو ناپسند کیا۔ سرسید کے انھیں کارناموں کا نتیجہ مدرستہ العلوم مسلمانان کی صورت میں ظہور پذیر ہوا۔

اگر ہم ان تینوں تحریکوں کو ایک ہی خانے میں لے آئیں تو یہ کہیں گے کہ یہ تینوں تحریکیں ناکام رہیں۔ وہابیوں کے مذہبی جوش اور عصبیت کی وجہ سے انھیں اپنے مقاصد میں کامیابی نہ ہوئی۔ سیاسی تحریک بھی مفید ثابت نہ ہوئی۔ جمال الدین افغانی نے جو روح سیاسی اسلام کے تن مردہ میں پھونکی تھی اس کی جھلک آذربائیجان کی تحریک آزادی میں، بخارا کی جمہوریت میں، مصر کی قومی تحریک میں اور افغانوں کی اپنے وجود کو برقرار رکھنے کی جدوجہد میں نمایاں ہے۔ یہاں اس کا سوال پیدا نہیں ہوتا کہ اس عظیم افغان نے جو کچھ سوچا تھا اس کا پورا ہونا پہلے کے مقابلے میں آج کل مشکل ہے۔ بظاہر سرسید کا مشن ان دونوں مصلحین کے مشن کے مقابلے میں اپنے مقصد کو پانے کے لیے بہت آگے بڑھ گیا تھا۔ دوا کی افادیت پر شبہ کیے بغیر ایک آدمی مریض کی صحت کے تقابلی جائزے کی بنیاد پر مذبذب ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اس طرح سے فیصلہ کرنا صریحاً

غلطی ہے اس لیے اس سے ہمیشہ خبردار رہنا چاہیے کہ وہ کسی وجہ کو ایسے نتائج سے منسوب کرے جو بہت سے موافق اور ناموافق چیزوں سے پیدا ہوتے ہیں۔ یہ ٹھیک اسی قسم کی غلطی ہے جس کے تحت لوگ علی گڑھ کے ذریعہ حاصل کیے گئے نتائج کے حدود کا جائزہ لینے کی کوشش کرتے ہیں ان نتائج کا حقیقی تجزیہ اس نتیجہ پر پہنچاتا ہے کہ اس میں بیک وقت دوسرے عوامل بھی کارفرما تھے مثلاً ماحول کا موافق ہونا اور کبھی ایسے ماحول کا کارفرما ہونا جو بالکلیہ ان اصولوں کے متضاد تھے جن کی علی گڑھ اسکول والے حمایت کرتے ہیں۔

سرسید کا نصب العین جسے مدرسۃ العلوم مسلمانان کے ٹرسٹیوں نے اب بھی زندہ رکھا ہے چنانچہ ایک بیاننامہ میں جو انھوں نے آنر ایبل کورٹ ٹیلر کو دیا تھا اس کا حوالہ بھی دیا ہے وہ ایک طرح قومی نشاۃ ثانیہ کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ اس تک پہنچنے کا واحد ذریعہ تعلیم ہے اور جو بذات خود مقصد نہیں ہے بلکہ اس کے مقاصد میں ہندوستانی مسلمانوں کی سماجی، مذہبی اور سیاسی اصلاح شامل ہے۔

صرف ایک لاعلاج شکی اور وہمی انسان ہی ان مقاصد کے پسندیدہ ہونے میں شبہ کر سکتا ہے لیکن تحریک کے آغاز کرنے والے نامور انسان کے لیے یہ بات بغیر کسی ناانصافی کے ممکن ہے کہ وہ یہ سوال پوچھے کہ آیا اس نے نصب العین کو پانے کے لیے صحیح راہ متعین کی یا نہیں۔ یہ بھی پوچھا جا سکتا ہے کہ ایک پیشوا کی حیثیت سے کم سے کم اختلات کے راستے کو اختیار کر کے کیا اس نے اپنے فکر کی تہی مائگی کو نہیں ظاہر ہونے دیا؟ کیا اس نے سمجھوتے کے طور پر اس نظام کو اپنانے میں تنگ نظری سے کام نہیں لیا؟ ایک دو رخا تعلیمی نظام اختیار کرانے میں جو کہ ابتدا ہی سے پورا قومی نظام تعلیم جو مسلمانوں کی مخصوص ضروریات کو بھی پورا کرتا ہو نہ اختیار کر کے تنگ نظری کا ثبوت نہیں دیا؟ کیا انھیں ایک فرقہ وارانہ یونیورسٹی کے قیام کے خیال کو موخر کرنا مناسب تھا؟ مستقبل میں جس کے نتائج صرف یہ نکلے کہ ہماری غلطیاں اور زیادہ ابھر کر سامنے آئیں جن کا بنیادی محرک وہی ابتدائی تصور تھا۔

اس بات سے انکار مشکل ہی سے کیا جا سکتا ہے کہ ایک پیشوا کی حیثیت سے سرسید تخیلی فکر سے محروم تھے۔ انھیں اپنی قوم کے لیے کام کرنے میں جن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا اس کے لیے بہت سی معذرتیں ہیں غدر کے بعد ایک عام مایوسی اور نامرادی کا جذبہ ہندوستانی مسلمانوں میں پیدا ہو گیا تھا اور اسے دور کرنے کے لیے انھوں نے کام کیے اور جس کی شدومد سے مخالفت بھی ہوئی اس کے بہت سے اسباب گنائے جا سکتے ہیں لیکن فوری حالات سے اتنا زیادہ متاثر ہونا اگر تنگ نظری کی بنا پر نہ ہو تو کوئی مضائقہ نہیں۔ ناامیدی جو کہ وسیع کی بلند نظری اور بلند حوصلگی کی محرومی کا سبب بنتی ہے درمیانی طبقہ کے لیے ایک قابل معافی کمزوری شمار کی جا سکتی ہے لیکن کسی رہنما کے لیے یہ گناہ کے مترادف ہے۔ کیونکہ مسلمانوں کے امیر خاندان غریب ہوتے

جا رہے تھے کیونکہ وفادار خاندانوں کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھا جا رہا تھا کیونکہ روزگار کا ملنا مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ ایسی جد و جہد جس کا مقصد قومی بیداری ہو اس کو صرف انتظامی امور کے لیے ماتحت طبقہ پیدا کرنے کے لیے وقف کرنا مضحکہ خیز ہے۔ یہ پہاڑ کھودنے اور چوہا نکالنے کے مترادف ہے۔

سرسید اور ان کے کچھ رفقا اس وقت کی سماجی برائیوں کے خلاف بہت بہادری سے لڑے۔ اور مذہب سے متعلق ہندوستانی مسلمانوں کے جو نظریات تھے ان کو تبدیل کرنے کے لیے انتھک کوشش کی۔ لیکن ان تمام معاملات کی سب سے بڑی بدقسمتی یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کی سماجی اور مذہبی بیداری کے نصب العین کو وقت بے وقت دہرایا جاتا رہا۔ جہاں تک ان کی یہ کوشش کامیاب ثابت ہوئی یہ بات ان لوگوں کو معلوم ہے جو اس سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ سماجی اصلاح کا ایک ذریعہ "تہذیب الاخلاق" تھا جب یہ ختم ہوا تو شاید اس کا کام بھی ختم ہو گیا۔ اس کے بعد اس کی جگہ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ نے لی۔ یہ کہاں تک اپنے مقصد میں کامیاب ہوا اس پر کوئی محاکمہ کرنا لا حاصل ہے۔ جیسا کہ ظاہر ہے کام کا خاتمہ ناخوشگوار رہا اور علی گڑھ کے کسی سپوت نے بھی سماجی اصلاح کے اہم کاموں کی طرف اپنی کوششیں صرف نہ کیں۔

مذہبی امور میں مٹھی بھر لوگ بھی ایسے نہیں تھے جو سرسید کی آنکھ سے آنکھ ملا کر کام کرتے۔ علی گڑھ کے طلبا کی سب سے اول نسل مستثنیات میں شمار کی جا سکتی ہے لیکن کیا یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ یہ لوگ سرسید کی آزادانہ تشریح و توضیح اور مذہبی درگزر کو تسلیم کر لیتے لیکن انھوں نے اسے مذہبی اختلافات کا نام دیکر چھوڑ دیا۔ لیکن اگر آج کے علی گڑھ کے بارے میں اگر کوئی صحیح بیان دیا جا سکتا ہے تو وہ یہ ہے کہ یہ مذہبی معاملات میں اپنے بانی کی تعلیمات کی حمایت نہیں کرتا۔ اس طرح کے حالات بہتر ہیں یا خراب لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ غیر مشتبہ اور غیر مشکوک ضرور ہیں۔ اس طرف یہ اشارہ کرنا ضروری ہے کہ سرسید کے ان مقاصد کی غیر شعوری طور پر تکمیل ان کے بہت اہم کام مدرسۃ العلوم کے ذریعہ ہوئی ہے۔ یہ چیز ہمیں ان کے کام کے خالص تعلیمی پہلو پر غور کرنے پر مجبور کرتی ہے۔

اس سلسلے کی سب سے پہلی چیز جو بہت ہی نمایاں ہے وہ یہ ہے کہ انھوں نے تعلیمی امور کو سیاسی امور سے بالکل الگ رکھا۔ چنانچہ سرسید نے تندہی سے اس کی تعلیم دی اور ارباب اقتدار اب بھی اس کی پیروی کرتے ہیں۔ تھوڑا سا غور و فکر اس عقیدہ کی خامی کو ظاہر کر دے گا۔ بنی نوع انسان ایک زندہ شے ہونے کے ناطے آپس میں ایک دوسرے سے جکڑا ہوا ہے۔ چنانچہ اس کی سرگرمیوں کا دارومدار ایک دوسرے پر ہے۔ آپ لوگوں سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہم تم کو ساری چیزوں سے الگ تھلگ یا آزاد رہ کر تعلیم دیں گے آپ دوسروں سے ایسا نہیں کہہ سکتے کیونکہ آپ خود ایسا نہیں کر سکتے۔ ہو سکتا ہے کہ آپ اس چیز سے

متاثر نہ ہوں لیکن آپ کی آنے والی نسل اس سے ضرور متاثر ہوگی۔ حضرت علیؓ نے فرمایا ہے کہ میں نے اپنی طویل عمر میں یہ دیکھا کہ انسان وقت کی مانند ہیں اور وہ اس طرح نہیں رہتے جیسے کہ ان کے والدین رہتے تھے۔

جس طرح قومی معاش کے بہت سے اہم مسائل قوم کو تعلیم دلائے بغیر حل نہیں کیے جاسکتے اسی طرح بغیر معاشی اور سیاسی حالات کو قابو میں کیے ہوئے تعلیمی اصلاح ممکن نہیں۔ لہذا نہ تو یہ ممکن ہے اور نہ اچھا کہ تعلیم کو سیاست سے الگ کر دیا جائے جیسا کہ سرسید نے کھلم کھلا کیا تھا۔ تعلیم کا مسئلہ کوئی اتنا آسان نہیں جیسا کہ لوگ سمجھتے ہیں۔ یہ ایک الجھا ہوا اور پیچیدہ مسئلہ ہے اور اس کا تعین بغیر آزادانہ پالیسی کے ممکن نہیں اس میں عمرانیات اور سیاست کا بھی اہم رول ہے۔ تمام تر سچی اور اچھی تعلیم کا مقصد اچھا شہری پیدا کرنا ہے۔ اگر ہم تعلیم کو سیاست سے الگ کر دیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم انسانوں کی جماعت ایک ایسی دنیا کے لیے تیار کر رہے ہیں جہاں ہمارا گزر ممکن نہیں۔ اس طرح کی غیر فطری علحدگی ماحول سے تنہائی کا عنصر پیدا کرتی ہے اور جس کی وجہ سے مادر درسگاہ علی گڑھ میں ایسے لوگوں کی قلت ہو سکتی ہے جو کہ اپنے ساتھیوں کے فلاح کے لیے قربانی دے سکیں۔

یہ قحط الرجال اس وجہ سے بھی ہے کہ علی گڑھ اتنا زیادہ مذہبی ادارہ نہ ہو سکا جتنا اس کو ہونا چاہیے کیونکہ اس سلسلے میں صرف ایک بات کہی جا سکتی ہے کہ آدمی جس جوش جذبے اور لگن کے ساتھ دوسروں کی فلاح کے لیے کام کرتا ہے اس میں اس کے مذہبی اعتقاد اور رجحان کو بہت دخل ہوتا ہے۔ ہم بڑی لگن سے اس وقت کام کرتے ہیں جب یہ سمجھتے ہیں کہ جو کچھ ہم کر رہے ہیں وہ بہت درست ہے اور قدرت کے اور ابدی قوت کے عین مطابق ہے۔ ہم سمندر کے باہر پانی کے لیے پیالہ نہیں ڈھونڈتے ہم جنگ میں اپنے اچھے جوانوں کو اس وقت تک نہیں بھیجتے جب تک ہمیں یہ نہ معلوم ہو جائے کہ ہمارا منصوبہ انسانی نجات کے منصوبہ کا ایک جزو ہے۔ علی گڑھ سے اسی طرح مذہبی انکار دعقائد پیدا کرنے کی امید وابستہ تھی۔ اگر یہ کہا جائے کہ علی گڑھ کو ایسا کرنے میں کامیابی حاصل ہوئی تو یہ بات مشتبہ اور مشکوک سمجھی جائے گی۔ اس سے زیادہ بدقسمتی کی بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ یہاں سے اسلام کے بہتر سپاہی نہیں پیدا ہوئے جس کے لیے صرف علی گڑھ ذمہ دار ہے ہمیں یا تو مذہبی تعلیم کا دعویٰ ہی نہیں کرنا چاہیے یا پھر وقت کے تقاضوں کو بہت ہی متاثر کن انداز میں پورا کرنا چاہیے۔

ہمیں آخری طور پر علی گڑھ کو سیکولر لرننگ اور تعلیم کا ایک مرکز تصور کرنا چاہیے۔ اس پہلو پر بحث کرنا بہت سے تعلیمی نصب العین کو سامنے لاتا ہے جس پر غور کرنے میں لوگوں میں باہم اختلاف رائے کی گنجائش نکلتی ہے۔ علی گڑھ اپنے ابتدائی فروغ کے زمانہ میں ایک تعلیمی مرکز بنا ہوا تھا اور اچھے عادات و

اطوار اور با اخلاق نوجوانوں کے پیدا کرنے میں اسے خاصی شہرت مل چکی۔ یہاں کے تعلیم یافتہ نوجوان کھیل کود سے خاصی دلچسپی رکھتے تھے اور ان کے اندر گھل مل کر رہنے کی بے پناہ صلاحیت پیدا ہو گئی تھی۔ ارباب اقتدار نے سمجھا کہ یہی سب کچھ بہت ہے اور اس کے نتائج سے مطمئن ہو گئے۔ ان خصوصیات کا ہونا بلاشبہ ضروری ہے اور ان کی موجودگی قابل تعریف ہے لیکن انھیں چیزوں کو ہر چیز کا منتہی سمجھ لینا کافی نہیں ہے۔ اعلیٰ تعلیم کا مقصد صرف اصلیت اور حقائق کا جان لینا نہیں ہے یہ سب چیزیں تو عام اداروں میں بھی بتائی جاتی ہیں۔ ایک لڑکا جب اسکول کو چھوڑتا ہے تو اس کو جسم و دماغ کی بہت سی باتیں سکھا دی جاتی ہیں۔ کالج میں پہنچ کر تعلیم کا معیار اعلیٰ ہونا چاہیے۔ یہاں پہنچ کر نوجوان کو دنیا کی لیڈرشپ کی تعلیم ملنی چاہیے جو کہ اسکول کی محدود فضا کے باعث نہیں دی جا سکتی۔ سماج میں ابتدائی، ثانوی، تکنیکی اور پیشہ ورانہ تعلیم کی ضرورتوں کے علاوہ بہت سی چیزیں ایسی بھی ہیں جن کی زندگی میں اور دنیا کے دوسرے کاموں میں ضرورت پڑتی ہے۔ ایک بڑے امریکی ماہر تعلیم کا کہنا ہے کہ جہاں فہم و ذکا ہے وہیں سے عقل و دانش کے سوتے پھوٹتے ہیں۔ یہ چیز ابتدائی اور ثانوی اسکولوں سے حاصل نہیں ہو سکتی تکنیکی مہارت بھی اسے پورا کرنے سے قاصر ہے، پیشہ ورانہ کامیابی بھی اس کے مرتبہ کو نہیں پا سکتی۔

ان تاملات کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اب علی گڑھ کے لیے یہ ایک مناسب موقع ہے کہ وہ ماضی کے ورثہ کا جائزہ لے اور مستقبل کے لیے ایک نصب العین کا تعین کرے۔ کیونکہ ایک محکم تعلیمی پالیسی کی تشکیل کے لیے نصب العین کا تعین ناگزیر ہے۔ پھر یہ نصب العین واضح بھی ہونا چاہیے کیونکہ نظریات مصالحت سے گریزاں ہوتے ہیں چاہے عملی طور پر مصالحت میں کتنی ہی خوبیاں کیوں نہ ہوں۔ اس لیے ان لوگوں کے ذہن میں جو عملی طریقہ کار سے علی گڑھ کے وقتی تعلیمی نظام کو ایک نیا موڑ دیں ان کے سامنے یہ سوال رہنا چاہیے کہ دس پندرہ برس میں کس طرح کے افراد کی اسلامی ہندوستان کو ضرورت ہوگی۔ ملت اسلامیہ کی ضروریات اور اس کی تقدیر کے لیے ایسے مقاصد کا نہ ہونا تعلیم کو بے جان نظام کی طرف لے جاتا ہے۔ جب ہم سوچ سمجھ کر اپنے نصب العین کی تشکیل کریں تو ہمیں اس بات کا بھی لحاظ رکھنا چاہیے کہ وہ فرومایہ نہ ہو اور بے وقعتی کا باعث نہ بنے۔ شاید ایسے ہی موقع کے لیے شاعر نے کہا ہے:-

مجھے کیا ملے گا اگر مجھے وہ مل گیا جس کو میں چاہتا ہوں
ایک خواب، ایک نفس، ایک لمحاتی خوشی
جو لمحاتی خوشی کے لیے دائمی رنج مول لیتا ہے
اور ابدیت کو ایک کھلونے کے لیے بیچ دیتا ہے

مجھے ابدیت کے مقابلہ میں ایک کھلونا لینے سے آگاہ رہنا چاہیے۔

(علی گڑھ میگزین بابت مارچ تا اگست ۱۹۲۰ء)

ذاکر صاحب نے کہا —

فرد اور سماجی ذمہ داری

جس طرح کچھ عرصے میں جسم کا ایک ایک ذرہ بدل جاتا ہے مگر جسم کی زندگی برابر جاری رہتی ہے، جس طرح درختوں کی پتیاں بدل جاتی ہیں مگر درخت وہی رہتا ہے، اسی طرح سماج کے افراد بھی برابر ختم ہوتے رہتے ہیں مگر سماجی زندگی باقی رہتی ہے۔ ہر زندہ چیز کی طرح سماج میں بھی دو کام برابر ہوتے رہتے ہیں، ایک تو بدلتے رہنے کا اور ایک اپنے حال پر قائم رہنے کا۔ ان میں سے کوئی ایک کام بھی رک جائے تو موت کا سامنا ہوتا ہے۔ جو جسم اپنے کو قائم نہیں رکھ سکتا وہ تو فنا ہوتا ہی ہے، پر جس میں اپنے کو بدلتے رہنے کی طاقت نہ رہے وہ بھی موت ہی کے گھاٹ اترتا ہے۔ سماج میں افراد کے وجود کی غرض بس یہ ہے کہ اس بقا اور فنا، تحفظ اور تغیّر، استقلال اور ہیجان کا ذریعہ بنیں، اور انھیں اس قابل بنانے کے لیے سماج کی تدبیر اور اس کا فرض نئی نسلوں کی تعلیم ہے۔ تعلیم دراصل کسی سماج کی اس جانی بوجھی، سوچی سمجھی کوشش کا نام ہے جو وہ اس لیے کرتی ہے کہ اس کا وجود باقی رہ سکے اور اس کے افراد میں یہ قابلیت پیدا ہو کہ بدلے ہوئے حالات کے ساتھ سماجی زندگی میں بھی مناسب اور ضروری تبدیلی کر سکیں۔ قومی زندگی میں تعلیم اسی طرح گزرے ہوئے زمانے سے موجودہ زمانے کو ملاتی ہے جیسے اکیلے آدمی کی زندگی میں اس کا حافظہ۔ جو سماج اپنی تعلیم کا نظام درست نہیں رکھتی وہ اپنے وجود کو خطرے میں ڈالتی ہے، اور جس طرح حافظے کے ختم ہو جانے سے اکیلی زندگی کا سلسلہ باقی نہیں رہتا اُسی طرح قومی تعلیم نہ ہونے سے قومی زندگی کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے اگر دنیا کی سماج میں ہندوستانی سماج کو اپنی علیحدہ حیثیت قائم رکھنی ہے اور دوسری سماجوں کے مقابلے میں اس کے پاس کچھ ہے جو اسے دوسروں سے الگ کرتا ہے اور اس قابل ہے کہ باقی رہے اور دنیا کی

زندگی اس سے مالا مال ہو، تو ہماری سماج کا فرض ہے کہ اپنی تعلیم میں ان خاص چیزوں کا خاص خیال رکھے جنھیں وہ خاص اپنا سمجھتی ہے یا اپنے گزرے ہوئے زمانے کو اپنی آنے والی نسلوں تک پہنچانے کا انتظام کرے، اس لیے کہ صرف کتابوں میں لکھے رہنے سے ہماری تاریخ زندہ نہیں رہ سکتی۔ اس کی زندگی کی بس ایک صورت ہے کہ وہ سماج کے ہر فرد کے دل و دماغ کے ریشے ریشے میں زندہ ہو۔

ہندی مسلمانوں کا مسئلہ

آپ ہندی مسلمانوں کی تعلیم کے مسئلے ہی کو لے لیجیے۔ کیا ہندستان کا قومی نظام تعلیم ان مسلمانوں کو اس بات کا موقع دے گا یا نہیں کہ وہ اپنی تمدنی زندگی کو اپنی تعلیم کا ذریعہ بنائیں؟ آپ جانتے ہیں کہ یہ مسئلہ ہماری قومی زندگی کے لیے کتنا اہم ہے۔ ممکن ہے کہ بعض نیک نیت مگر انتہا پسند قوم پرست متحدہ ہندستانی قومیت کی ایسی تصویر اپنے ذہن میں رکھتے ہوں کہ جس میں مسلمانوں کو یہ حق دینا قوم کی قوت اور قوم کی ترقی کے لیے مضر ہو۔ مگر ہمارے ماہرین تعلیم اگر نیک نیتی سے ہندستان کی تعلیم کا نظام بنائیں تو مجھے یقین ہے کہ وہ مسلمانوں کی اس خواہش کو خوشی سے قبول کر لیں گے کہ وہ اپنی تعلیم کی بنیاد اپنے تمدن پر رکھیں، کہ صحیح تعلیم اور صحیح سیاست دونوں کا یہی تقاضا ہے۔ آپ مجھے معاف فرمائیں اگر اس معزز مجمعے کے سامنے میں صفائی سے یہ بات پیش کروں کہ مسلمانوں کو جو چیز متحدہ ہندستانی قومیت سے بار بار الگ کھینچتی ہے اس میں جہاں شخصی خود غرضیاں، تنگ نظری اور دیس کے مستقبل کا صحیح تصور نہ قائم کر سکنے کو دخل ہے وہاں اس شدید شبہے کا بھی بڑا حصہ ہے کہ قومی حکومت کے ماتحت مسلمانوں کی تمدنی ہستی کے فنا ہونے کا ڈر ہے اور مسلمان کسی حال میں یہ قیمت ادا کرنے پر راضی نہیں۔ اور میں بحیثیت مسلمان ہی نہیں، سچے ہندستانی کی حیثیت سے بھی، اس پر خوش ہوں کہ مسلمان اس قیمت کے ادا کرنے پر تیار نہیں۔ اس لیے کہ اس سے مسلمانوں کو جو نقصان ہو گا سو ہو گا ہی، خود ہندستان کا تمدن پستی میں کہاں سے کہاں پہنچ جائے گا ؎

گرچہ مثل غنچہ دلگیریم ما   گلستاں میرد اگر میریم ما

یہی وجہ ہے کہ سچے مسلمان ہندستانی اپنی مذہبی روایات، اپنی تاریخ، اپنی تمدنی خدمات اور اپنے تمدن سے توقعات کی وجہ سے اپنے ملی وجود کو خود اپنے لیے ہی بے بہا نہیں سمجھتے بلکہ ہندستانی قومیت کے لیے نہایت بیش قیمت جانتے ہیں، اور اس کے مٹائے جانے یا کمزور کیے جانے کو اپنے ہی ساتھ ظلم نہیں بلکہ ہندستانی قوم کے ساتھ بھی سخت خیانت سمجھتے ہیں۔ ہندستانی مسلمانوں کو اپنا دیس کسی

اور سے کم عزیز نہیں ہے، وہ ہندستانی قوم کا جزو ہونے پر فخر کرتے ہیں، مگر وہ ایسا جزو بننا کبھی گوارا نہ کریں گے جس میں ان کی اپنی حیثیت بالکل مٹ چکی ہو۔ ان کا حوصلہ ہے کہ اچھے مسلم ہوں اور اچھے ہندی، اور نہ کوئی مسلمان انھیں ہندی ہونے پر شرمائے نہ کوئی ہندی ان کے مسلمان ہونے پر انگلی اٹھائے، ہندستان میں ان کا دین ملک سے بے تعلقی کا عذر نہ ہو بلکہ خدمت کی ذمے داری ان پر ڈالے، ان کے لیے عیب نہ ہو بلکہ امتیاز۔ اس خیال کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جب مسلمان سیاست کے میدان میں دوسری تمام ہندی آبادی کے پہلو بہ پہلو ہوں گے، جداگانہ اور مشترکہ انتخابات کے جھگڑے ننٹے کبھی بھلائے جا چکے ہوں گے اور غالباً ملازمتوں کے حصول میں بھی مسلمان ایک خود دار گروہ کی طرح بجائے تحفظ کے مقابلے پر اصرار کرتے ہوں گے، اس وقت بھی وہ یہ ضرور چاہیں گے کہ ان کی تعلیم کے نظام میں ان کی تمدنی چیزوں کو پورا پورا دخل ہو اور مجھے یقین ہے کہ مستقبل کی دانش مند ہندستانی حکومت ان کے اس مطالبے کو پورا کر کے مسلمانوں کی ترقی اور ان کی ترقی سے خود اپنی مضبوطی کا سامان کرے گی۔

مشترکہ تہذیب

جب ذات پات، مذہب، زبانوں کے فرق سے ہمارا دیس ٹکڑے ٹکڑے نظر آتا ہے۔ جس ملک میں اسٹیشنوں پر مسلمان پانی اور ہندو دودھ ملتا ہے، جس دیس میں مختلف قسم کی نسلیں ملتی ہیں، جہاں بالکل مختلف انداز کے تمدن ساتھ ساتھ رائج ہیں، جہاں ایک کا سچ دوسرے کا جھوٹ ہے جہاں بت پرست اور بت شکن کو قدرت نے ساتھ ساتھ دکھ سکھ کے لیے، ساتھ جینے اور ساتھ مرنے کے لیے یک جا کر رکھا ہے، اس ملک میں نوجوانوں سے ایسے مل کر کام کرنے کی آس ذرا مشکل ہے۔ مگر دل یہی گواہی دیتا ہے کہ تھوڑے دن اور دھکے کھانے کے بعد اس ملک کے نوجوان دیس کی سیوا کے لیے یک دل ہو جائیں گے۔ اس لیے کہ میرا عقیدہ ہے کہ ہندستان کی قسمت میں قدرت نے یہ بات رکھی ہے کہ یہاں بالکل مختلف قسم کے انسانی نمونے ایک دوسرے سے مل کر ایسا آدم تیار کریں جو تہذیب و تمدن کی ایک نئی تشکیل کر سکے۔ قدرت کے اس تجربے اور قدرت کے اس ارادے میں اس کی مدد کرنا تمھارا کام ہے اور اس مدد کے لیے اپنے آپ کو اچھا آدمی بنانا اور اپنے دل کو کینہ کپٹ سے خالی کرنا لازمی ہے، قربانیوں کے لیے تیار رہنے کی ضرورت ہے، اپنے ارادے کو مضبوط کرے اور اپنے نفس کی خواہشوں پر قابو پانے کی ضرورت ہے۔ اگر تم میں اور تمھارے ساتھی نوجوانوں میں یہ صفتیں نہ ہوں اور آج ہی تمھیں کسی مہاتما کی کرامت سے سیاسی اور تمدنی زندگی کے اچھے اچھے

ادارے بیٹھے بٹھائے مفت میں قدرت کی طرف سے تحفے میں مل گئے تو بھی یاد رکھو کہ یہ تحفہ بے سود ہوگا یہ ادارے سب کے سب نیچے ہوتے ہوتے اسی سطح پر پہنچ جائیں گے جس پر کہ تمھاری اخلاقی قوت ہوگی اور ان کی شکل ایسی بگڑ جائے گی کہ مشکل سے انھیں کوئی پہچان بھی سکے گا۔ قوم اپنے ارادوں اور خود اپنے مرتبے کو اسی درجے پر قائم رکھ سکتی ہے جس پر وہ خود انھیں اپنے زور بازو سے پہنچانے کے قابل ہو۔ اس لیے ہندستان کی بڑائی تمھاری خوبیوں پر منحصر ہے۔ اپنی ذات کی تمام قوتوں کو ترقی دے کر ایک ایسی اخلاقی شخصیت بناؤ جسے بھارت ماتا کے سامنے پیش کرنے جاؤ تو تمھیں خود شرم نہ آئے، اور وہ خوش ہو کر اسے قبول کرے۔

تعلیم کا بنیادی مقصد

کون انکار کر سکتا ہے کہ روٹی کمانا زندگی کے اہم ترین کاموں میں سے نہیں ہے لیکن اس فرض کو پورا کرنے میں آدمی پر اپنی شخصیت، انفرادیت اور آدمیت کا احترام بھی لازم ہے۔ جانور بھی اپنا پیٹ پالنے کے لیے اپنی فطری جبلت اور قدرتی صلاحیت کو ترک نہیں کرتے، غریب انسان کیوں اپنے پیٹ کی خاطر اپنی فطرت اور اپنی قدرتی صلاحیتوں کی بھینٹ چڑھانے پر مجبور ہو؟ عام انسانی معیشت کے لیے بھی یہی اچھا ہے کہ آدمی وہی پیشہ اختیار کرے جس کی خاص صلاحیتیں اس میں ودیعت کی گئی ہیں حسن اتفاق کہ جو آدمیت اور معیشت دونوں کا تقاضا ہے، صحیح تعلیم کی بھی وہی ایک راہ ہے۔ اس لیے کہ تعلیم کا یہی صحیح طریقہ تو ہے کہ جب ثانوی منزل میں طالب علم کے ذہن میں تفریق پیدا ہو تو اس کی ذہنی نشو و نما اُن اشیائے تمدنی کے ذریعے کی جائے جو اُس کی مخصوص ذہنی ساخت اور فطری صلاحیتوں کے مطابق اور مناسب ہوں۔ تمدنی اشیاء ذہن معروض ہوتی ہیں، ان کے اندر اپنے وجود میں لانے والے یا لانے والوں کی ذہنی قوتیں محفوظ ہوتی ہیں۔ جب کوئی دوسرا دماغ ان کو سمجھتا، اپناتا، برتتا ہے تو یہ قوتیں اس دماغ کی نشو و نما کا سامان بہم پہنچاتی ہیں۔ اہل علم کے اس مجمع پر یہ بات مخفی نہ ہوگی کہ ان ذہنی قوتوں کے ذریعے جو اشیاء تمدن میں مضمر ہوتی ہیں، دوسرے ذہنوں کو غذا پہنچانا اور اس سے ان کو تربیت دینا ہی اصل تعلیم ہے تعلیم نام ہی ذہنِ معروض کے یوں ذہن موضوع بننے کا ہے۔

ثانوی تعلیم کا نظریہ

ذہنی تربیت کے لیے تو کہیں ادب اور لسانیات سے، کہیں فنون لطیفہ سے، کہیں صنعت و

حکمیات سے، مختلف مدرسے زیادہ کام لیں گے، لیکن غالباً ہماری ثانوی تعلیم کا یہ نیا نظام اپنے طلبہ کے اُفقِ اقدار کو معین کرنے اور وسعت دینے کے لیے انھیں اپنے نصب العین سے آگاہ کرنے، انھیں اپنے ماضی کا رمز شناس بنانے، اور اُن میں مستقبل کے امانت دار ہونے کا احساس پیدا کرنے کے لیے تمام مدارس میں اپنے دین، اپنی تاریخ، اور اپنی زبان کی تعلیم کا خاص انتظام رکھے گا اور انھیں خالی چندہ وصول کرنے یا اعتراضات ٹال سکنے کا وسیلہ نہ بنائے گا۔ وہ ان چیزوں کی تعلیم کے بہتر سے بہتر اسلوب ڈھونڈے گا، ان پر بہتر سے بہتر استاد تیار کرنے کا خاص اہتمام کرے گا، اس لیے کہ ثانوی تعلیم کی منزل میں نوجوان اپنے جذبات کی تہذیب کے لیے شخصی مثال کا بہت ہی زیادہ محتاج ہوتا ہے اور اخلاقی و مذہبی اقدار کی پہچان، و ران سے لگاؤ کے لیے تو اکثر تاریخی اور اپنے ماحول کی شخصیتوں کا اثر ہی فیصلہ کن ثابت ہوتا ہے۔

شاید یہ نیا نظام اپنے استادوں کا اس سے زیادہ احترام کرے گا جتنا کہ ہم آج کل کرتے ہیں۔ وہ شاید بہت دیکھ بھال کے بعد کسی کو استاد بننے دے گا۔ لیکن جس کو استاد بنالے گا اسے قومی زندگی میں وہ مرتبۂ بلند بھی دے گا جس کا کہ ہر اچھا استاد مستحق ہے۔ وہ اپنے نوجوانوں کو، کہ سب سے گراں بہا متاعِ ملّی ہیں، اُن استادوں کے سپرد کرے گا تو ان کی امانت پر بھروسہ بھی کرے گا۔ پھر اُن استادوں کے پاس قوم کے دل کی کنجی ہو گی، اُن کی شخصیت کے جادو سے اُجاڑ دلوں سے حیاتِ تازہ کے چشمے ابلیں گے اور متحیر اور متلاشی نوجوانوں کی شبِ تاریک جستجو، بے شمار راہ نما تاروں سے جگمگا اٹھے گی۔

شاید اس نئے نظام میں جس کا ذکر اس وقت ایک خواب کے بیان سے زیادہ نہیں معلوم ہوتا، مگر جس کو سچ کر دکھانا بہت کچھ آپ کے، میرے ہاتھ میں ہے، غالباً تعلیم کا یہ خالص کتابی و نظری طریقہ بھی اس طرح نہ چھایا رہے گا جیسا کہ آج ہے۔ اور مدرسوں میں ہمارے بچے اور نوجوان صرف سُن سُن کر، اور مقررہ کتابیں پڑھ پڑھ کر، اپنے دماغوں کو غیر منہضمہ معلومات اور واقفیت سے نہ اٹا کریں گے بلکہ کارخانوں اور معملوں اور کتب خانوں میں اپنی جستجو، اپنے شوق اور اپنی محنت سے، بے شک شفیق اور لائق استادوں کی نگرانی میں، مگر اپنی آزادی اور ذمے داری کے پورے احساس کے ساتھ، یہ اکتشاف کی لذت سے آشنا ہو سکیں گے۔

لیکن ذہنی تحصیل کے اس انفرادی طریقے کے باوجود شاید یہ مدرسے جماعتی احساس پیدا کرنے اور جماعتی تعاون کی عادت ڈالنے کے مواقع اور وسائل سے اس طرح تہی دامن نہ ہوں گے جس طرح ہمارے موجودہ مدارس ہیں، اور شاید سیرت کی تربیت کو معلومات کے حصول سے پیچھے رکھنے پر یہ مدرسے

کسی حال میں راضی نہ ہوں گے۔ شاید جماعتی احساس اور جماعت کی خدمت کا ولولہ ان مدرسوں میں خالی زبانی تلقین کے ذریعے پیدا نہ کیا جائے گا بلکہ مدرسوں کی زندگی خود باہر کی جماعتی زندگی کا نمونہ ہوگی اور اس کے انتظام و انصرام کا بوجھ زیادہ تر خود طلبہ پر ہوگا۔ ہمارے یہ نئے مدرسے نوجوانوں کی خود مختار آبادیاں ہوں گے جن میں نئی نسل اپنی جماعتی زندگی کی تشکیل کا عملی تجربہ حاصل کرے گی اور ایک آزاد قوم کے نوجوان آزادی کو قائم رکھنے اور برتنے اور ترقی دینے کے لیے تیار ہوں گے۔

نوجوانوں سے خطاب

ہمارے یہ مدرسے بے شک اسلامی مدرسے ہوں گے اور اسلامی نصب العین ہی ان کے سامنے ہوگا مگر اس نصب العین کی کوئی تنگ اور غلط تعبیر ان مدرسوں کو فرقہ پروری اور جماعتی خود غرضی کا مرکز نہ بنانے پائے گی۔ اور بے جا تعصب ان کی نظر سے اس نکتے کو چھپا نہ سکے گا کہ اگر ہم مسلمان ہونے کی حیثیت سے حریت خواہ ہونے پر مجبور ہیں، اگر ہم دنیا سے ہر قسم کی غلامی کو مٹانے پر مامور ہیں، اگر ہم انسانیت کی ایسی معاشی تنظیم چاہتے ہیں جس میں امیر و غریب کا فرق انسانوں کی اکثریت کو انسانیت کے شرف ہی سے محروم نہ کر دے، اگر ہم دولت کی شرافت کی جگہ تقویٰ کی شرافت کا قیام چاہتے ہیں، اگر ہم نسل اور رنگ کے تعصبات کو مٹانا اپنا فرض سمجھتے ہیں، تو ان سب فرائض کو پورا کرنے کا موقع سب سے پہلے خود اپنے پیارے وطن میں ہے جس کی مٹی سے ہم بنے ہیں اور جس کی مٹی میں ہم پھر واپس جائیں گے۔ چنانچہ ہمارے نئے مدرسوں کی تعلیم نوجوانوں کے دل میں جماعتی خدمت کی وہ لگن لگائے گی کہ جب تک ان کے ارد گرد، ان کے اپنے گھر میں، غلامی رہے گی اور افلاس، فلاکت رہے گی اور جہل، بیماریاں رہیں گی اور بدکرداریاں، پست حوصلگیاں رہیں گی اور مایوسیاں، یہ چین کی نیند نہ سوئیں گے اور اپنے بس بھر ان کو دور کرنے میں اپنا تن من دھن سب کھپائیں گے۔ یہ روٹی بھی کمائیں گے اور نوکریاں بھی کریں گے، پر ان کی نوکری خالی پیٹ کی چاکری نہ ہوگی بلکہ اپنے دین اور وطن کی خدمت ہوگی جس سے ان کے پیٹ کی آگ ہی نہیں بجھے گی دل اور روح کی کلی بھی کھلے گی۔ یہ اپنے دینی نصب العین ہی کی وجہ سے اپنے دیس کی، کہ کبھی دنیا اسے جنت نشان کہتی تھی، پر جو آج بیشمار انسانوں کے لیے دوزخ سے کم نہیں، سیوا کریں گے اور ایسا بنائیں گے کہ پھر اس کے بھوکے، بیمار، بے کس، بے امید غلام باسیوں کے سامنے انھیں اپنے رحمٰن و رحیم، رزاق و کریم، حیّ و قیوم خدا کا نام لیتے وقت شرم سے سر نہ جھکانا پڑے گا کہ انھیں بعض کی زیادتیوں اور بعض کی کوتاہیوں نے،

بعض کے ظلم اور بعض کی غفلت نے آج اس حال کو پہنچا دیا ہے کہ ان کا وجود محدود نگاہوں کو اس کی شان ربوبیت پر ایک دھبّہ سا معلوم ہوتا ہے۔

اور یہی نہیں، یہ اپنی اس بے غرض خدمت سے خود اپنے دیس والوں کو تنگ نظر وطنیت کے عذاب سے بچائیں گے اور اپنے وطن کو دنیا اور انسانیت کا خادم بنائیں گے۔ ہمارا وطن اپنی آبادی کے لیے دوسروں کی بربادی، اپنی ترقی کے لیے دوسروں کا تنزل، اپنی قوت کے لیے دوسروں کی کمزوری، اپنی آزادی کے لیے دوسروں کی غلامی کے سامان کبھی نہ کرے گا بلکہ جس طرح ہمارا ہر فرد اس نئے نظام تعلیم کی مدد سے اپنی تمام مخصوص صلاحیتوں کو نشو ونما دے کر اپنی تربیت یافتہ شخصیت کو جماعتی خدمت کے لیے وقف کرے گا، اسی طرح ہمارا وطن اپنی تمام مخصوص قوتوں کو ترقی دے کر دنیا اور انسانیت کی خدمت گزاری کا شرف حاصل کرے گا۔

آپ کہیں گے کہ یہ شخص ہمیں مستقبل کے یہ فرضی افسانے کیوں سنا رہا ہے۔ معاف کیجیے، اس لیے سناتا ہوں کہ اس طرف امید کی ایک جھلک نظر آتی ہے اور ہر جگہ "شاہد" اس لیے لگا تا جاتا ہوں کہ اپنے آس پاس ان امیدوں کے بر آنے کے خلاف بھی قرائن پاتا ہوں لیکن ایک بات یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں اور وہ یہ کہ اگر مسلمانوں کو اس ملک میں ایک خوددار آزاد جماعت کی طرح زندہ رہنا ہے تو ان کو اپنی قومی زندگی کے پچھلے پون سو سال پر سختی سے محاسبہ کرنا ہوگا، پچھلی مساعی کی تہ میں جو نصب العین کارفرما تھا اس پر نظر ثانی کرنی ہوگی اور اگر اس سے اعلیٰ تر نصب العین ان کے ہاتھ آ گیا، جیسا کہ میرے عقیدے میں ضرور آئے گا، تو پھر اس نصب العین کے حصول کے لیے منجملہ اور چیزوں کے اپنا ایک خاص نظام تعلیم بھی مرتب کرنا ہوگا جو کسی دوسرے ناقص نظام کی ناقص تر نقل نہ ہوگا بلکہ ہماری مخصوص تخلیق ہوگا۔ ہمیں ثانوی تعلیم کے نظام سے پہلے عام ابتدائی تعلیم کا نظام بنانا اور جاری کرنا ہوگا، ایک خاص عمر پر بچوں کے رجحانات کی پڑتال کا انتظام کرنا ہوگا پھر ثانوی تعلیم کے لیے ایک ساتھ مختلف قسم کے، غالباً چار پانچ قسم کے مدارس قائم کرنے ہوں گے، ان مدرسوں میں علاوہ اس شعبۂ تمدن کے جو ہر مدرسے کا مخصوص ذریعۂ تعلیم ہوگا، اپنے دین، اپنی تاریخ اور اپنی زبان کی تعلیم کا نصاب تعین کرنے اور اس کے استادوں کی تیاری میں خاص توجہ سے کام لینا ہوگا، ذہنی نشو ونما میں انفرادی طریقے کے ساتھ مدارس کے اندر اور باہر جماعتی خدمت کے مواقع کثرت سے فراہم کرنے ہوں گے، کتابی تدریس کی جگہ عملی اکتشاف کو دینی ہوگی اور خالی واقفیت کی جگہ صحیح ذہنی تربیت اور خالی علم کی جگہ اچھی سیرت کو مرکز توجہ بنانا ہوگا اور اپنے مدرسوں کو قومی زندگی کے ساتھ ربط دینے کی تدبیریں نکالنی ہوں گی۔

سیاسی رہنماؤں کے نام

اس وقت ہماری خوش قسمتی سے بابو راجندر پرشاد جی یہاں موجود ہیں اور ہماری کانفرنس کا ابھی چند منٹ میں افتتاح فرمائیں گے۔ میں ان کی معرفت تعلیمی کام کرنے والوں کی یہ التجا اپنے ملک کے سب سیاسی رہنماؤں کی خدمت میں پہنچانا چاہتا ہوں کہ خدا کے لیے اس ملک کی سیاست کو سدھا لیجیے اور جلد سے جلد ایسی ریاست کی طرح ڈالیے جس میں قوم، قوم پہ بھروسا کر سکے۔ کمزوروں کو زورآور کا ڈر نہ ہو، غریب امیر کی ٹھوکر سے بچا رہے، جس میں تمدن، تمدن امن کے ساتھ پہلو بہ پہلو پھل پھول سکیں اور ہر ایک سے دوسرے کی خوبیاں اجاگر ہوں، جہاں ہر ایک وہ بن سکے جس کے بننے کی اس میں صلاحیت ہے اور وہ بن کر اپنی ساری قوت کو اپنے سماج کا جاگر جانے۔ میں جانتا ہوں کہ ان باتوں کا کہہ دینا سہل ہے اور کرنا کسی ایک آدمی کے بس کی بات نہیں، لیکن مجھے یقین ہے کہ آج یہ بات ہمارے سیاسی رہنماؤں کے ہاتھوں میں اتنی ہے جتنی پہلے کبھی نہ تھی کہ کچھ سمجھ کر، کچھ سمجھا کر، کچھ مان کر، کچھ منوا کر ایسی ریاست کی نیو رکھ دیں جب تک یہ نہیں ہوتا ہم تعلیمی کام کرنے والوں کا حال قابل رحم ہے۔ ہم کب تک اس سیاسی ریگستان میں ہل چلائیں، کب تک شبہے اور بدگمانی کے دھوئیں میں تعلیم کو دم گھٹ گھٹ کر سسکتے دیکھیں۔ کب تک ہم اس ڈر سے تھراتے رہیں کہ ہماری عمر بھر کی محبت کو کوئی ایک سیاسی حماقت، کوئی ایک سیاسی ضد بھسم کر دے گی۔ ہمارا کام بھی کوئی پھولوں کی سیج تو ہے نہیں، اس میں بھی بہت مایوسیاں ہوتی ہیں اور اکثر دل ٹوٹتا ہے، پھر جب ہمارے قدم ڈگمگائیں تو ہم کہاں سہارا ڈھونڈیں؟ کیا اسی سماج میں جہاں بھائی ایک دل نظر نہیں آتے، کوئی قدر آخری قدر نہیں معلوم ہوتی، جس میں کوئی گیت نہیں جو سب مل کر گائیں، کوئی تہوار نہیں جو سب مل کر منائیں، کوئی شادی نہیں جو سب مل کر رچائیں، کوئی دکھ نہیں جو سب بٹائیں، ہماری یہ مشکل دور کیجیے اور جلد کیجیے۔ اب بھی دیر ہو چکی ہے اور دیر نہ جانے کیا دن دکھائے۔

استاد کا منصب

مصلحوں اور پیغمبروں کی طرح استاد کو بنی بنائی شخصیتوں سے واسطہ نہیں پڑتا بلکہ ان سے سروکار ہوتا ہے جو ابھی بن رہی ہیں۔ مصلح اور پیغمبر تو بنی ہوئی شخصیتوں سے اپنا کام لے لیتے ہیں، انھیں ان عقیدوں، رسموں، اداروں اور خیالوں کا خادم بنا دیتے ہیں جن کے پھیلانے یا قائم کرنے کے لیے یہ آئے ہیں۔ جو انھیں

قتل کرنے نکلتے ہیں ان کی زندگی کا رُخ بدل کر انھیں مخالفوں کے واسطے قہر بنا دیتے ہیں۔ جو پہلے ایک طرف جھکتا تھا اس کا سراب دوسرے کے سامنے جھکا دیتے ہیں۔ استاد کو سابقہ پڑتا ہے بے بنی شخصیتوں سے اسے اپنے شاگرد کی بننے والی شخصیت کا رخ سمجھنا اور اس کے امکانات ترقی کا اندازہ کرنا پڑتا ہے اور اسے درجۂ کمال تک پہنچانے میں مدد کرنی ہوتی ہے۔ نہ خالی عقل کی نگاہ سے یہ امکانات دکھائی دیتے ہیں کہ آدمی کی زندگی میں نہ جانے کتنے غیر عقلی حصے ملے ہیں، نہ خالی وجدان اور طبیعت کی ذکاوت پر استاد بھروسا کر سکتا ہے۔ یہاں عقل اور وجدان کو ملانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اچھا استاد ان مختلف سانچوں سے آشنا ہوتا ہے، جن میں آدمی کی سیرت عموماً ڈھلتی ہے اور ان عام معلومات کے ساتھ بچے کی خاص حالت کا مشاہدہ اسے صحیح نتیجے تک پہنچا سکتا ہے۔ چنانچہ پہلے بیان کی ہوئی صفتوں کے ساتھ اچھے استاد میں صحیح مشاہدے کی صفت بھی ہونی چاہیے کہ اس کے بغیر وہ اپنے شاگرد کی پوری شخصیت کی تشخیص نہیں کر سکتا، اس کے بغیر اس کی پوری ترقی میں مدد نہیں دے سکتا۔ اس مشاہدے میں اکثر خود استاد کی بنی بنائی شخصیت روک بن جاتی ہے۔ آدمی مردہ چیزوں کا مشاہدہ تو کچھ بے تکلفی سے کر سکتا ہے، پر انسان کے تو جسم کا مشاہدہ تک بے تکلفی سے کرنا دشوار ہے۔ دل اور روح کا مشاہدہ تو کیسے بے تعلقی سے ہو سکتا ہے؟ اس کے لیے خود اپنے سے لڑنا اور اپنے کو دبانا ہوتا ہے۔ محنتی اور بار شوق، سیدھے اور شریر، مطیع اور گستاخ، تیز اور سست ہنس مکھ اور روتی صورت سب کو ایک نظر سے بے تعلقی کے ساتھ دیکھنا سہل کام نہیں۔ مگر اچھے استاد کا کام بھی سہل نہیں ہوتا اور یہ شرف ہر ایک کو تو حاصل بھی نہیں ہو سکتا۔

جماعتی تمدن اور ذہنی تربیت

جماعتی تمدن کی یہ ساری مادی اور غیر مادی چیزیں جو نشو و نما پذیر دماغ کے لیے غذا کا کام دیتی ہیں خود بھی کسی نہ کسی ذہن انسانی کی پیداوار ہوتی ہیں۔ کسی نہ کسی انسانی ذہن ہی نے ان میں یہ روپ لیا ہے کسی انسانی ذہن ہی نے ان میں اپنی توانائی کو محفوظ کر دیا ہے۔ ان میں انسانی ذہنوں کی بصیرتیں اور آرزوئیں اور کاوشیں ہی تو مضمر ہیں۔ یہ سب کسی متاع ذہنی رکھنے والے کا چھپا خزینہ ہے یا کسی سر شوریدہ کی بالین آسائش۔ غرض سب ذہن انسانی کی رہین منت ہیں اور اس لیے سب کی اپنی اپنی ذہنی ساخت ہے۔

۱ جب کوئی تربیت طلب ذہن ان چیزوں سے دوچار ہوتا ہے تو ان کی چھپی ہوئی قوتیں آشکارا ہوتی ہیں۔ ان میں سوئی ہوئی توانائیاں اس نئے ذہن میں جاکر بیدار ہوتی ہیں۔ اس کے لیے یہ دفینے اپنا

منہ کھول دیتے ہیں اور پُرسکون بالینوں سے اس کے لیے پھر شور ہائے و ہُو اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ہر تربیت خواہ ذہن کے لیے ہر تمدنی چیز اپنی مخفی قوتیں پیش نہیں کرتی۔ جسمانی غذاؤں کی طرح ذہنی غذائیں بھی سب کو ایک ہی سی نہیں راس آتیں کسی کو کوئی بھاتی ہے کسی کو کوئی۔ اور راز اس کا یہ ہے کہ ہر ذہن کو وہی چیز بھاتی ہے جس کی ذہنی ساخت اس کی اپنی ذہنی ساخت سے مطابق ہو۔ یہی تعلیم کا بنیادی گُر ہے۔ اس کو بھولنا یا اس کے خلاف چلنا ایسا ہے جیسے اندھے کو رنگ سے اور بہرے کو آہنگ سے تربیت دینے کی کوشش۔ جس دماغ کی ساخت ادبی کاوشوں کے نتیجوں کے مطابق ہو اسے صنعتی اشیا تمدن سے، جس کی ساخت علمی اور نظری چیزوں سے مناسبت رکھتی ہو اُسے عملی چیزوں سے تعلیم دینا یا اس کے برعکس، سب تعلیم کی ماہیت سے ناواقفیت کی دلیل ہے اور اصلی ذہنی تربیت کے دروازوں کو بند کر کے آدمیوں کو طوطوں اور سرکس کے جانوروں کا مرتبہ دینا چاہتی ہے۔

سفرِ حیات اور زادِ راہ

زندگی میں ہم جس شخص کے متعلق سمجھتے ہیں کہ اسے اپنے نفس پر قابو حاصل ہے اس کی ہم بڑی عزت کرتے ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس صفت کی دل سے قدر کرتے ہیں، ہو سکے تو اسے اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش بھی کریں مگر بس "طبیعت ادھر نہیں آتی"! اس صفت اخلاقی کی تیاری اطاعت کی مشق سے ہوتی ہے۔ پہلے بچے کی اس اطاعت سے جو وہ مجبوراً کرتا ہے، پھر بڑے کی اس اطاعت سے جو وہ سمجھ کر کرتا ہے، ایک کو خارجی اطاعت کہہ سکتے ہیں، دوسری کو داخلی۔ پہلی میں خوف کو بہت کچھ دخل ہوتا ہے، دوسری میں سمجھ اور عقل کو۔ جوں جوں عمر بڑھتی جاتی ہے خوف کا عنصر کم ہوتا جاتا ہے۔
آپ جو اب زندگی کی کشاکش سے بلاواسطہ دوچار ہونے کے لیے کمربستہ ہو رہے ہیں، آپ کہ گھر اور مدرسے اور کالج کے اثر سے آزاد ہو کر اپنی تربیت کو آپ سنبھالنے کی منزل میں قدم رکھ چکے ہیں، آپ جاننا چاہیے کہ اگر گھر اور مدرسے اور کالج نے آپ میں اطاعتِ داخلی کی بنیادیں استوار نہیں کی ہیں تو آپ کے اس نئے کام کی دشواری ناممکن کی حد تک پہنچ سکتی ہے۔ اگر آپ کے زادِ راہ میں چند اخلاقی اصول بھی نہیں ہیں جو آپ کی عملی زندگی پر اثر انداز ہوں، اگر آپ کے اندر احساسِ اقدار ہی پیدا نہیں ہوا ہے اگر اخلاقی احکام کی پابندی کو آسان بنانے والی عادتیں آپ میں پڑی ہی نہیں ہیں تو یوں سمجھیے کہ آپ تیراکی کی ابتدائی مشق کے بغیر ہی دریا میں کود رہے ہیں اور دریا بھی طوفانی ہے، قدم قدم پر بھنور ہے آپ سابقہ تیاری کے بغیر ایک سرکش اور منہ زور گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر بیٹھ رہے ہیں، نہ ہاتھ باگ پر ہے

نہ پاہے رکاب میں! خدا ایسوں کی بھی مدد کرتا ہے اور بسا اوقات یہ بھی ڈوبتے نہیں، ساحل مراد پر پہنچ جاتے ہیں اور گر کر چور چور نہیں ہوتے بلکہ منزل مقصود پر جا اترتے ہیں۔ اس کا فضل ہے جس پر ہو جائے۔ کبھی کسی کی ایک نظر، کبھی زندگی کے بے شمار حادثوں میں سے کوئی حادثہ، کوئی شدید واردات قلبی، سابقہ بے توجہی کی تلافی کر دیتے ہیں، آدمی کو کسی اخلاقی اصول کا سہارا مل جاتا ہے اور وہ اب زیادہ توجہ اور زیادہ خلوص سے اس پر چل کر پہلے سے عادتوں کے نہ پڑنے کی کمی کو جیسے تیسے پورا کر لیتا ہے۔ لیکن آپ میں سے بہتوں کو آپ کی تعلیم و تربیت نے کچھ نہ کچھ خیالات اور کچھ نہ کچھ عادتیں تو اس زندگی کے دشوار سفر کے لیے ساتھ دی ہی ہوں گی۔ ان تصورات اخلاقی کو زیادہ وضاحت کے ساتھ سمجھتے جانا، ان کی حکمت کے علم کے ساتھ ان کی اطاعت کے داخلی میلان کو قوی تر کرتے جانا، یہ اب آپ کا تعلیمی تربیتی کام ہے، جسے خود آپ کو انجام دینا ہے۔ اور اس بصیرت اخلاقی کی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ آپ میں صداقت ہو، آپ خود تو اپنے سے جھوٹ نہ بولیں، خود اپنے کو تو دھوکا نہ دیں۔ عادتوں کو راسخ کرنے کی ضرورت ہے مشق کی اور مشق کے لیے موقعے کی۔ زندگی کے ہر موڑ پر اس کا موقع ہے، جو اس سے کام لیتا ہے وہ اپنی عادتیں سنوارتا جاتا ہے۔ آپ کے نفس کے جو دو حصے ہیں، ایک جو حیوان کی حیثیت سے پیدائش سے ساتھ ہے، دوسرا جو انسان کی حیثیت سے ذہنی کاوش کا نتیجہ ہے، ایک جو طبیعت کا ساتھی ہے، دوسرا جو اخلاق کا پابند ہے، ایک جو من مانی زندگی چاہتا ہے، دوسرا جو آزادی سے خود اپنے کو احکام اخلاقی میں باندھ کر رکھنا چاہتا ہے، آپ کا سینہ ان دونوں کی کشاکش کا عرصۂ کارزار ہے۔ اس کشاکش میں فتح کس کی ہو، طبیعت کی یا اخلاق کی، حیوانی جبلت کی یا انسانی اقدار عالیہ کی؟ دوسرے کی فتح کا سامان کرنا اور برابر کرتے رہنا "آپ اپنی تربیت" کا کام ہے۔

شخصیت کی تعمیر

آزاد عمل اور اس پر تنقیدی نظر کے مواقع زندگی کے سب ہی شعبوں میں ملتے ہیں مگر جو اپنی سیرت کی تربیت کے کام کو اہم کام جانتا ہے وہ اپنے لیے بے غرض خدمت کے خاص میدان کا متلاشی رہتا ہے۔ اس میں عمل کے اندر اخلاقی آزادی کا یقین واضح طور پر سامنے رہتا ہے۔ مے دانگیں کی لاگ کے بغیر جو کام ہوتا ہے وہ آزاد اخلاقی مطالبے ہی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ بڑی شخصیتوں کے لیے تو یہ میدان روز بروز وسیع تر ہوتا جاتا ہے، لیکن معمولی حیثیت کے لوگ بھی اپنی سیرت کی تربیت کے لیے کوئی نہ کوئی کام بے لوث خدمت کا منتخب کر سکتے ہیں۔ بسا اوقات کسی وقتی جذبے سے آدمی ایسے کسی کام کی ذمے داری اپنے سر لے لیتا ہے۔ اس گھڑی کو خوش قسمتی کی گھڑی سمجھنا چاہیے۔ اس کام کو چاہے چھوٹا سا ہی کام ہو برابر

انجام دیتے رہنا اپنی تربیت میں بڑی مدد دیتا ہے۔ یہ پہلے چھوٹا سا کام ہوتا ہے، مگر اس پہ جمنے سے سیرت میں ایک اعتماد پیدا ہوتا ہے جو اس کے حلقۂ عمل کو وسعت دیتا ہے اور بسا اوقات ایک چھوٹے سے بے غرض کام کی پابندی سیرت میں بڑی پختگی پیدا کر دیتی ہے اور بڑھ کر اور پھیل کر اس کے مختلف پہلوؤں پہ چھا جاتی ہے۔ بدنصیب ہیں وہ جو اس کے فیض سے محروم ہیں۔

جامعہ ملیہ کا پیغام

تعلیم کے کام کا پرسکون، دھیما پن اور ایک انقلاب انگیز سعیِ ملی کی ہنگامہ آرائی کا یہ تعلق بادی النظر میں کچھ انوکھا سا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن سچ یہ ہے کہ اس دور انقلاب میں جامعہ کے نام سے ان تمام نیم شعوری اور تحت شعور تعلیمی منصوبوں نے ایک شکل اختیار کی جو ایک عرصے سے مسلمانوں کے اہل فکر و عمل کو ایک صحیح قومی تعلیمی نظام کے ترتیب دینے پر اکسا رہے تھے۔ اس میں محمد قاسم کی تمناؤں، سید احمد خاں کی آرزوؤں، سید محمود کی تجویزوں، وقار الملک کے ارادوں، اعلیٰ حضرت کی سلطانیہ کالج جیسی اسکیموں، غرض خدمت اور احیائے ملت کی بہت سی چھوٹی بڑی کوششوں کا پرتو ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ قوم اپنے وجود کے وظیفۂ بنیادی سے غافل نہیں ہے، اور جب بھی اپنی زندگی کے باقی رکھنے اور ترقی دینے کی طرف متوجہ ہوتی ہے تو اسے تعلیم، صحیح تعلیم ہی راہ پر گامزن ہونے کا خیال ہوتا ہے۔ ۱۸۵۷ء میں جب ہماری قومی زندگی کا شیرازہ جو خود ہمارے ہاتھوں بہت بوسیدہ ہو چکا تھا، بکھرا تو ہم نے دیوبند اور علی گڑھ میں اسے پھر سے جوڑنے کی سعی شروع کی۔ اس صدی کے ربع اول میں مسلمان جس عالمگیر ابتلا میں رہے اس میں انھوں نے جامعہ ملیہ قائم کی۔ یہ قوم میں صحیح زندگی کے ہونے کا ثبوت ہے۔ لیکن بس رمقِ زندگی کا۔ یہ اس حقیقت کو ظاہر کرتا ہے کہ جب صحت کا کچھ شائبہ بھی جسم جماعتی میں ہو تو وہ اپنے ہیجانات کا اظہار مسترباجیسے تشنجی ہنگاموں میں نہیں کرتی بلکہ اس بحرانی قوت کو دھیمے دھیمے مگر منزل مقصود کی طرف یقینی طور پر چلنے والے ارادوں کا خزینۂ توانائی بنا دیتی ہے۔ یہ سبق ہے ہماری قوم کو کہ وہ اپنے جوش و خروش کو گھنٹوں اور دنوں کے اندر خالی نعروں اور جلسوں میں منتشر نہ کر دے بلکہ صبر طلب و صبر آزما تعمیری مساعی میں اسے برسوں، قرنوں بلکہ صدیوں پر پھیلانا سیکھے ہیں۔ میں نے کہا کہ یہ جامعہ ثبوت ہے اور سبق۔ البتہ بہت ہی کمزور سا ثبوت اور بہت ہی روکھا پھیکا سبق۔ کیا عجب ہے کہ تائید ایزدی ہو تو کام کرنے والوں کی استقامت اور قوم کی پذیرائی اس ثبوت کو بہت قوی اور اس سبق کو بہت دل نشین بنا دے۔

حصارِ شعلہ میں پھولوں کی جستجو ہے مجھے

آج ملک میں باہمی نفرت کی جو آگ بھڑک رہی ہے اس میں ہمارا چمن بندی کا کام دیوانہ پن معلوم ہوتا ہے۔ یہ آگ شرافت اور انسانیت کی سرزمین کو جھلسے دیتی ہے۔ اس میں نیک اور متوازن شخصیتوں کے تازہ پھول، کیسے پیدا ہوں گے؟ حیوانوں سے بھی پست ترسطح اخلاق پر ہم انسانی اخلاق کو کیسے سنوار سکیں گے۔ بربریت کے دور دورے میں تہذیب کو کیسے بچا سکیں گے؟ اس کے لئے خدمت گذار کیسے پیدا کرسکیں گے؟ جانوروں کی دنیا میں انسانیت کو کیسے سنبھال سکیں گے؟ یہ لفظ شاید کچھ سخت معلوم ہوتے ہوں لیکن ان حالات کے لیے جو روز بروز ہمارے چاروں طرف پھیل رہے ہیں اس سے سخت لفظ بھی بہت نرم ہوتے۔ ہم جو اپنے کام کے تقاضوں سے بچوں کا احترام کرنا سیکھتے ہیں، آپ کو کیا بتائیں کہ ہم پر کیا گزرتی ہے جب ہم سنتے ہیں کہ بہیمیت کے اس بحران میں معصوم بچے بھی محفوظ نہیں ہیں۔ شاعر ہندی نے کہا تھا کہ ہر بچہ جو دنیا میں آتا ہے اپنے ساتھ پیام لاتا ہے کہ خدا ابھی انسان سے پوری طرح مایوس نہیں ہوا، مگر کیا ہمارے دیس کا انسان اپنے سے اتنا مایوس ہو چکا ہے کہ ان معصوم کلیوں کو بھی کھلنے سے پہلے مسل دینا چاہتا ہے؟ خدا کے لیے سر جوڑ کر بیٹھیے اور اس آگ کو بجھائیے۔ یہ وقت اس تحقیق کا نہیں ہے کہ آگ کس نے لگائی کیسے لگی، آگ لگی ہوئی ہے، اسے بجھایئے۔ یہ مسئلہ اس قوم اور اس قوم کے زندہ رہنے کا نہیں ہے، مہذب انسانی زندگی اور وحشیانہ درندگی میں انتخاب کا ہے، خدا کے لیے اس ملک میں مہذب زندگی کی بنیادوں کو کھدنے نہ دیجیے۔

بنیادی تعلیم کے اصول

ذہن معروض اور ذہن موضوع میں مطابقت اور مناسبت کا خیال رکھنا تعلیم کا بنیادی گُر ہے۔ جیسے بہرے کے ذہن کی تربیت موسیقی سے نہیں کی جا سکتی، جیسے اندھے کے ذہن کی نشوونما کے لیے مصوری سے کام نہیں لیا جا سکتا، اسی طرح جس ذہن کی ساخت ادبی اور تخلیقی ہو اس کو صنعت کے سرمایۂ تمدن سے، جس کی ساخت نظری ہو اس کو عملی اشیاء سے تربیت نہیں دی جا سکتی۔ اس میں ضد کرنا قدرت کے منشا کی نافرمانی کرنا ہے، ذہن کی تربیت کی راہ کو بند کرنا ہے، آدمیوں کو میاں مٹھو بنانے کی نامبارک کوشش ہے۔

تعلیم کی ہر منزل میں اس حقیقت کے کچھ مطالبے ہیں۔ ابتدائی تعلیم کی منزل میں اس کا تقاضا

کہاں ہے؟ یہ وہ منزل ہے جہاں متعلمین کی تعداد سب سے زیادہ ہوتی ہے۔ یہاں اگر ذہنی ساختوں کا بھر پور تنوع ہوتا تو نظامِ تعلیم کی تشکیل میں بڑی دشواریاں ہوتیں۔ حسنِ اتفاق کہ قدرت نے کچھ ایسا انتظام کیا ہے کہ عمر کی اس منزل میں لڑکے لڑکیوں میں عملی رجحان بہت عام بلکہ کم و بیش عالمگیر کر دیا ہے۔ اس عمر کے فطری تقاضوں میں ہے کہ بچے کچھ کرنا چاہتے ہیں، کچھ بنانا چاہتے ہیں، بگاڑنا چاہتے ہیں، جوڑنا چاہتے ہیں توڑنا چاہتے ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ہاتھوں کی مدد سے سوچنے، برت کر پہچاننے، کچھ کرکے سیکھنے کا انتظام فطرت کی طرف سے ہوا ہے۔" ادھر کا اشارہ صاف اور واضح ہے کہ مدرسہ بس نادانی اور ضد ہی میں اسے نظر انداز کرسکتا ہے۔ لازم ہے کہ اس منزل میں عملی کام کو تعلیم کا یعنی تربیت ذہنی کا وسیلہ اور اس کا مرکز بنایا جائے۔ اس منزل میں ذہن کی قوتوں کو پیدا کرنے میں ہاتھ کا کام کتاب سے زیادہ کارگر ثابت ہوتا ہے پھر حسنِ اتفاق دیکھیے کہ یہ جو ذہنی تربیت کا مطالبہ ہے، جماعت کے اغراض کا تقاضا بھی یہی ہے جماعتی زندگی کے قائم و برقرار رکھنے کے لیے سوادِ اعظم کا ہاتھ کے دولت آفریں کے کام میں مصروف ہونا ضروری ہے۔ صرف کتابیں پڑھا پڑھا کر اور اس طرح پڑھا کر کہ نرے منشی پیدا ہوں، کھیت اجاڑ ہوجائیں اور کارخانے ویران، دیوانگی نہیں تو کیا ہے؟ یا سب ہاتھ سے کام کرنے والوں کو ذہنی تربیت سے ہی محروم رکھنا ایسی جماعتی معصیت ہے کہ جس کی اصلاح وہ بحرانی شکلیں اختیار کرتی ہے کہ ایک بار تو جماعت کا نظام درہم برہم ہو ہی جاتا ہے۔ پھر اگر جماعت کا نظام الدتی ہو، مدرسے صرف اوپر کے چند خاندانوں کے بچوں کی تربیت کا کام کرتے ہوں، انھیں کو پڑھنا لکھانا، انھیں کو اوروں سے ممتاز کرنا اور الگ رکھنا، ان کا مقصد ہو تو یہ بات کچھ سمجھ میں بھی آئے کہ خود غرض بدنصیب اپنے تفوق کو قائم رکھنے کے لیے دوسروں کے بچوں کو ہی نہیں خود اپنے بچوں کو صحیح ذہنی تربیت سے محروم کرتے اور خالی طمع کاری پر راضی رہتے ہیں۔ لیکن ایک جمہوری ریاست میں، جیسی کہ ہماری ہے، یہ بات سمجھ میں نہیں آسکتی۔ ہمارے ملک میں دس بارہ سال سے ہاتھ کے کام کو مدرسوں میں مرکزی جگہ دینے کی تجویز لوگوں کے سامنے ہے اور 'بنیادی تعلیم' کے نام سے معروف ہے۔ تقریباً سارے ملک میں نام تو رائج ہوگیا ہے، لیکن مدرسوں کی ماہیت اور ان کی روح، سچ تو یہ ہے کہ، پوری طرح معقول درجے تک بھی بدلی نہیں ہے۔ اس کانفرنس کو کوشش کرنی چاہیے کہ نام کے ساتھ کام بھی بدلے اور اس تبدیلی کے پیدا کرنے میں کوئی چیز بھی اتنی موثر نہیں ہوسکتی جتنی کہ مثال۔ پرانی ڈگر کو چھوڑ کر نئی راہ پر چلنا ہمیشہ دشوار ہوتا ہے۔ محتاط لوگ جھجکتے ہیں، کم حوصلہ لوگ ٹھٹکتے ہیں، کوئی ہمت والا آگے بڑھ نکلتا ہے تو یہ پیچھے پیچھے ہو لیتے ہیں۔ جو مدرسے مسلمانوں کے انتظام میں ہیں ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ ان میں تعلیم کے اس صحیح اصول پر چلنے کی کوشش کی جائے۔ ہمیں اس نئے کام میں اولیت کا

شرف مل سکتا ہے۔ مگر اس کام کو ٹھیک ڈھنگ پر ڈالنے کے لیے بہت سوچنا ہے، بہت کچھ کرنا ہے ہاتھ کے کام کی تعلیمی تربیتی تاثیر سے پورا فائدہ کیوں کر اٹھایا جا سکتا ہے، اسے کتنا وقت دینا چاہیے، اس میں تھکن کب پیدا ہونے لگتی ہے، ہاتھ کے کام سے دوسری معلومات اور مہارتوں اور مسلمانوں کو کس طرح مربوط کیا جائے، کام کو جماعتی احساس کا معین کیسے بنایا جائے، مربوط درس کے لیے استادوں اور شاگردوں کو کس قسم کے امدادی سامان کی ضرورت ہوگی، اسے کس طرح فراہم کیا جائے، یہ اور ایسے بے شمار سوالات تشنۂ تحقیق ہیں مسلم یونیورسٹی کا شعبۂ تعلیم اگر اس کام کو اپنے ہاتھ میں لے، ایک نمونے کا بنیادی مدرسہ قائم کرے اور بنیادی تعلیم سے متعلق مسائل کی تحقیق کے نتائج ملک کے سب کام کرنے والوں کے لیے شائع کرے تو ایک اہم قومی کام اس کے ہاتھوں انجام پا سکتا ہے۔ خدمت میں سرداری کے راستے بند نہیں ہیں!

علی گڑھ اور قومی زندگی

دوستو! میں سمجھتا ہوں کہ یونیورسٹیوں کے قانون میں جو تبدیلیاں ہوئی ہیں ان کے صحیح منشا کو جاننا اور اس کا اوروں کے علم میں لانا ہمارا ضروری کام ہے۔ علی گڑھ کو بدنام کرکے مسلمانوں کے دل میں اس کی محبت کو کم کرنا نہ علی گڑھ کے ساتھ نیک سلوک ہے، نہ مسلمانوں کے ساتھ، نہ ہندوستان کے ساتھ میرا تو یقین ہے کہ علی گڑھ کو قومی زندگی میں بڑا کام انجام دینا ہے۔ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں اور پھر کہنا چاہتا ہوں کہ یہ اہم کام علی گڑھ ہی کے حصے میں آیا ہے اور علی گڑھ ہی اسے انجام دے سکے گا جیسا کہ صدر جمہوریہ کی علی گڑھ میں تشریف آوری کے موقع پر میں نے کہا تھا" وہ کام ہندوستانی تدبر اور ہندوستانی تعلیم دونوں کا بنیادی کام ہے، یعنی ایک سیکولر جمہوری ریاست میں ایک متحدہ قوم کی تعمیر کا کام اور اس کی زندگی میں ۴ کروڑ مسلمان شہریوں کا حصہ اور مقام۔ کتنا بڑا کام ہے اور کیسا دلکش کام، یہ مختلف تمدنی اور تہذیبی عناصر کو باہم سمو کر ایک متوازن اور ہم آہنگ زندگی کی تعمیر کا کام جس میں ہر جزو دوسرے جزو کی رونق کو چمکائے اور ایک حسین وجمیل کل کی تشکیل میں مدد دے۔ ماضی کے سارے خزانوں کو چاہے کہیں سے آئے ہوں ہر ہندوستانی کی مشترک میراث بنا دینا، کہ سب ہمارے ہی گم شدہ لعل ہیں، سب کو ایک مشترک ماضی سے مالا مال کرنا، سب کو مستقبل میں ایک جد و جہد کا ولولہ بخشنا کوئی چھوٹا کام ہے؟ اس عزیز وطن کے ہر مسلمان شہری کے ذہن میں یہ یقین رچا دینا کہ ان کا دین اور ہندوستانی زندگی کو صالح زندگی بنانے میں ان کا مخصوص منصب،

یہ اُن پر ذمے داری کا ایک اور بوجھ ڈالتے ہیں اور خدمت کا ایک نادر موقع پیش کرتے ہیں، یہ بے وفائی یا بے اعتنائی کا بہانا نہیں ہیں۔ کچھ چھوٹا کام ہے یہ؟" اور پھر میں نے عرض کیا تھا کہ علی گڑھ جس طرح کام کرے گا، علی گڑھ جس اسلوب پر سوچے گا، علی گڑھ ہندستانی زندگی کے مختلف شعبوں کے لیے خدمت کی جو پیش کش دے سکے گا اس سے متعین ہو گا۔ ہندوستانی قومی زندگی میں مسلمانوں کا مقام۔ اور ہندستان جو سلوک علی گڑھ کے ساتھ کرے گا اس پر، ہاں اس پر، بڑی حد تک منحصر ہو گی۔ وہ شکل جو ہماری قومی زندگی مستقبل میں اختیار کرے گی۔ میں یقین رکھتا ہوں کہ علی گڑھ قومی زندگی کو مالا مال کرنے میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھے گا اور مجھے بھروسا ہے کہ ہماری قوم بھی اس کے کام کی قدر کرنے میں بخل نہ کرے گی۔

گم شدہ لمحوں کی بازیافت

میرا دھیان اس وقت ۴۴ برس پہلے کی اس گرم دوپہر کی طرف رہ رہ کر جاتا ہے، جب میں پہلی بار اس دانش گاہ میں پہنچا تھا۔ اپنے دوسرے سیکڑوں ساتھیوں سے ذرا کم اجنبی، کہ میرے دو بڑے بھائی پہلے سے یہاں موجود تھے۔ یہ دونوں یہاں رہ بس کر یہاں کے ہو چکے تھے، میں نووارد تھا۔ سہ پہر میں شہر سے ایک جوتا، کچھ کتابیں اور ایک لالٹین بھائی صاحب نے مجھے خرید وادی تھی۔ شہر گئے تھے ہم پیدل، ادھر سے آئے تھے اِکے میں، اس لیے کہ ہاتھ میں سامان اٹھا کر چلنا اُس زمانے میں کسرِ شان سمجھا جاتا تھا! مجھے یاد ہے کہ بھائی صاحب مجھے اپنے کچی بارک کے کمرے میں چھوڑ کر اپنے دوستوں سے ملنے چلے گئے تھے اور مجھے بتا گئے تھے کہ مغرب کے بعد جب گھنٹی بجے تو ڈائننگ ہال میں کھانا کھانے چلے جانا۔ گھنٹی بجی، میرے اندازے سے ذرا پہلے۔ میں نے ترکی ٹوپی، ترکی کوٹ، اور جراب اور انگریزی جوتے پہنے بغیر کھانا کھانے کی مشق ۱۶ برس تک بہم پہنچا چکا تھا یہ نئی وردی پہننے میں دیر کی اور دیر کیسے نہ کرتا۔ جوتے کا فیتہ ایک سوراخ سے کھینچا تو دوسرے سے نکل گیا، اس میں سلیقے سے گرہ دینے کا جو فن سہ پہر میں بھائی صاحب نے سکھایا تھا اور جس کی کچھ مشق بھی اس نئے جوتے پر کرا دی تھی وہ گھبراہٹ میں سب ذہن سے اتر گیا اور کئی بار کے بست و کشاد سے ایک نئے انکشاف کی طرح ہاتھ آیا۔ لیکن جب کس بندھ کر کمرے سے نکلا تو دیر ہو چکی تھی اور دوسرے زیادہ جوکس ساتھی ڈائننگ ہال جا چکے تھے۔ ع

یک لحظہ غافل بودم و صد سالہ راہم دور شد

راستہ معلوم نہ تھا، نہ جانے کتنی دیر ادھر اُدھر گھومتا پھرا اور اپنے خیال میں تلاش منزل کی ناکام کوشش کے بعد پھر اپنے ہی کمرے کے سامنے آن پہنچا۔ کمرہ بند تھا، دوسرے کمرے بھی سب بند تھے۔ گھڑی دیکھی، یہ بھی اسی دن نئی نئی بھائی صاحب نے دی تھی۔ اس سے پہلے اسکول کے گھنٹے یا سورج کی مدد سے دن کی تقسیم کر لیا کرتا تھا۔ گھڑی جو دیکھی تو معلوم ہوا کہ کھانے کی گھنٹی کا جو وقت بتایا گیا تھا اُسے گزرے صرف آٹھ منٹ ہوئے ہیں۔ اور اس جانِ ناتواں نے اس آٹھ منٹ میں خود فراموشی، بازیافت، تلاش منزل، گم کردہ راہی اور ناکامی سفر کے جملہ مقامات طے کر لیے تھے!

سچ ہے، وقت صرف گھڑی کی سوئیوں ہی سے نہیں ناپا جاتا، جس پہ یہ گزرتا ہے اس کی کیفیت بھی اس کا ایک پیمانہ ہے، کبھی چند منٹ، انتظار اور مایوسی کے چند منٹ پہاڑ بن جاتے ہیں، کبھی کشف حقیقت قصد نیاک، مشاہدہ جمال، مجاہدانہ سرفروشی کے ایک لمحے میں ازل اور ابد سمٹ کر سما جاتے ہیں، کبھی بے مقصدی، بے راہ روی، بے دلی میں پوری پوری عمر بیت جاتی ہے کہ گھڑی کا ایک منٹ بھی اس پر حقارت سے ہنستا ہے۔ خیر تو ہم آٹھ منٹ بعد جہاں سے چلے تھے وہیں پہنچ گئے۔ چارپائیاں باہر نیم کے درختوں کے قریب پڑی تھیں، وہاں بیٹھے ہی تھے کہ دوسرے ساتھی کوئی ہاتھ میں ہاتھ ڈالے، کوئی گنگناتے، کوئی ہنستے، کوئی ذرا چپ چپ، واپس آنے لگے یعنی جانا، کھانا، آنا، سب ۹۔۱۰ منٹ میں ختم۔ اس زمانے میں اور چیزوں میں تو نہیں البتہ کھانے میں، بہت ہی فوجی شان تھی۔ اس پر زیادہ وقت صرف کرنا بدذوقی سمجھا جاتا تھا اور منتظمین کی طرف سے بھی ایسا اہتمام تھا کہ زیادہ وقت صرف کرنے کا موقع بھی کم ہی ہوتا تھا۔

یہ اس دن کی یاد اس تفصیل سے کیوں آرہی ہے آج؟ شاید اس لیے کہ وہاں سے وہ زندگی شروع ہوتی ہے جس نے ۴۴ برس میں بہت سے رنگ دیکھے، مگر جس میں اس دانش گاہ سے برابر دل کو تعلق رہا گہرا تعلق، نہ ٹوٹ سکنے والا تعلق۔ یہاں بہت کچھ سیکھا اور زیادہ نہ سیکھ سکنے پہ دلگیر ہونا سیکھا۔ ساری زندگی کو یہاں کے ناتمام کام کا تتمہ بنانے کا ولولہ یہیں سے پایا، یہاں دوست پائے، دوستی کی قدر پہچانی، مل جل کر کام کرنا سیکھا، اختلاف کے باوجود نباہ کے ڈھنگ سیکھے، بھانت بھانت کی زندگی کے نمونوں کو پرکھنا اور برتنا سیکھا، اپنی قومی زندگی کے سارے عیب یہاں برملا دیکھے، پر اس کے پچھتاوے کے آنسوؤں سے اپنی آنکھیں بھی نم پائیں، اس کی ساری آرزوؤں اور تمناؤں کا نقش بھی یہیں اپنے دل میں اُبھرتا ہوا محسوس کیا، اپنی خام تند مزاجیوں اور عاجلانہ بدگمانیوں پر نادم ہونا سیکھا، سوکھے پتوں کی طرح ایک چنگاری سے شعلے کی طرح بھڑک بھی اُٹھے، مگر سیچے کوئلے کی طرح سلگتے رہنے کا سبق بھی یہیں سے ملا، صلاحیتوں کی جھجکتی کونپلوں کو نشو و نما دے سکنے کے لیے ان میں زندگی کی تند اور تیز ہواؤں سے

بچانے کی حکمت، مگر سیرت کی تعمیر کے لیے جماعتی زندگی کی ریل پیل میں مردانہ وار شامل ہونے کی ضرورت بھی یہیں پہچانی، خلوت و جلوت کی جدا جدا تعلیمی اور تربیتی تاثیروں کا یہیں پہلی بار تجربہ کیا، یہاں فرمانبرداری سیکھی، اطاعت شعاری سیکھی، ادب سیکھا، بڑوں کا ادب، ہم چشموں کا ادب، چھوٹوں کا ادب اور خود اپنا ادب، سعادت مندی اور وفا شعاری کے ساتھ خود اختیاری، نہ اس علمی بستی کے نظام کی پابندی کو عین آزادی جانا، پر جب اس نظام کو ضمیر کے مطالبوں کو ٹکراتا پایا تو اس سے بغاوت کی طاقت بھی اسی چشمۂ حیات سے ارزانی ہوئی، باغی بنے، نکالے گئے، دوسری بستی بسانے میں ایک ربع صدی کاٹ دی مگر اس مادر علمی کی طرف سے دل میں کبھی کوئی تلخی محسوس نہیں کی۔ بن باس میں بھی دل اسی میں اٹکا رہا، حالات بدلے ملک آزاد ہوا، یہاں کا نظام بھی بدلا، ذمے دارانہ حیثیت سے اس کی خدمت کا موقع میسر آیا، بری بھلی جو خدمت بن پڑی خدمت کی، اور امید تھی کہ عمر بھر کی سرگشتگی کے بعد سر شوریدہ کو یہیں بالین آسائش نصیب ہو جائے گی، مگر یہ مقدر نہ تھا، صحت کی خرابی فرائض کی انجام دہی میں مخل ہوتی رہی، بالآخر محبت پر ذمے داری کے احساس نے غلبہ پایا اور میں آپ سے رخصت ہو گیا۔

آج کاسۂ دل، کہ جگہ جگہ سے ٹوٹا ہوا بھی ہے، اس سب پر جو یہاں سے پایا شکر گزاری سے بھرا ہے۔ اور ان تمام کوتاہیوں پر جو اس دانش گاہ عزیز کی خدمت میں رہ گئیں شرمساری سے بھی چھلک رہا ہے۔ میرے لیے تو اس دانش گاہ سے وابستگی کی یاد ہی زندگی کا بڑا انعام ہے۔

آزادی کا مطلب

صحیح آزادی کہتے ہی ہیں خوشی سے اپنے اوپر ضروری پابندی لگانے کو۔ بے راہ روی، من مانے تلوّن کو آزادی نہیں کہتے۔ تلاش حق اور تبلیغ حق میں آزادی کے حق کے ساتھ دانش گاہوں پر سماجی ذمے داریوں کو بخوشی اٹھانے کا فرض بھی عائد ہوتا ہے۔ ہندستان کی دانش گاہوں کی سماجی ذمے داری بہت بھاری ہے۔ ملک صدیوں کی غلامی سے آزاد ہوا ہے۔ غلامی، ذہن اور روح کا بڑا مہلک روگ ہوتی ہے غلام، ذمے داری کے تصور سے عاری ہوتا ہے اور اخلاق کے تصور سے بے نصیب، آزادی میں قدم رکھتے ہی اپنے ہر فعل کے حسن و قبح کا بوجھ اس کے سر آ پڑتا ہے۔ اخلاق کی پابندیاں اپنے سر لے کر ہی اس کو سچی آزادی نصیب ہوتی ہے۔ غلامی سے آزادی میں یہ سفر بڑا دشوار گزار سفر ہوتا ہے۔ ذہن اور روح کی قوتوں کو بیدار کرنا ہوتا ہے، پرانی عادت بار بار قدموں میں لغزش پیدا کرتی ہے، اقدار صالحہ کے سہارے ہی سے ان قدموں کو قوت ملتی ہے، رہروؤں کو ثابت قدمی نصیب ہوتی ہے۔ کبھی کبھی تو یہ نو وارد اس

نئی آزاد دنیا میں اجنبی اجنبی سے لگنے لگتے ہیں۔ ان کے ذہنوں کو اقدار کے معاملے میں صاف کرنا، ان کے جذبات کو فلاح قومی کے ساتھ وابستہ کرنا، انھیں خود غرضی اور نفس پروری کی تنگ و تاریک گھاٹیوں سے نکال کر مفاد جماعتی کی روشن وسعتوں کا خوگر بنانا۔ فرقہ وارانہ وفاداریوں کو نکھار کر انھیں وحدت قومی کا دلدادہ بنانا، ان کی تن آسانیوں کو مفید جماعت منفعت میں بدلنا۔ غرض قومی مزاج کو آزادی کے مطالبوں کے مطابق بنانے کا کام بڑی حد تک دانش گاہوں کا کام ہے۔ یہ کام چونکہ آزادی ہی میں ہو سکتا ہے اس لیے ہر دانش مند، آزادی دوست، جمہوری حکومت، دانش گاہوں کی آزادی میں خلل انداز ہونے سے باز رہے گی۔ مگر دانش گاہوں کو بھی یہ مہتم بالشان کام انجام دے کر اپنے کو اس آزادی کا مستحق ثابت کرنا ہوگا۔ اس وابستگی کی بنا پر جو مجھے اس دانش گاہ سے رہی ہے اور ہے، جی چاہتا ہے کہ کاش یہ اس میدان میں اوروں سے آگے رہتی اور مجھے ایسا لگتا ہے کہ اسے اوروں سے کسی طرح کم نہیں بلکہ کچھ زیادہ ہی اس کا موقع ہے کہ یہ آزاد ہندوستان کی ذہنی اور روحانی قیادت میں اوروں سے آگے رہے۔ میری دانست میں کسی ہندی دانش گاہ کے طلبا میں ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی کی ایسی اور اس نسبت میں آمیزش نہیں ہے جتنی کہ یہاں ہے۔ اس کے اساتذہ میں بھی تنوع جس طرح جلوہ گر ہے دوسری جگہ کم ہے اس کی اقامتی زندگی کی روایتیں اسے ایک مثالی علمی بستی بنانے میں ساز گار ہیں۔ آزادی کے بعد بڑی مایوسی کے دور سے گزر کر خود اعتمادی حاصل کی ہے اور نئے آزاد سماج کے تجربے نے اس کے ساتھ ایک تازہ اور شاداب تعلق خاطر پیدا کیا ہے۔ اس سے یہ توقع کسی طرح بے جا نہیں کہ یہ صالح انفرادی اور اجتماعی زندگی، ذمے دار شہریت، بے لاگ تحقیق، نڈر تنقید، بے لوث خدمت، بے باک صداقت مخلصانہ تعاون، باہمی ادب، تمیز، سلیقہ اور سب سے زیادہ وحدت قومی کے تصور میں سرشاری کی خصوصیتوں سے ممتاز، ایک تعلیمی بستی بن جائے گی جس پر ہمارا وطن ناز کر سکے گا۔ مبارک ہے وہ دانش گاہ جس کے طلبا، اساتذہ اور کارکنوں کی مشترک کوشش سے، کہ بغیر سب کی کوشش یہ کام ہونے والا نہیں، یہ منصوبہ بروئے کار آ سکے۔

اراکینِ دار المصنفین سے خطاب

آخر میں چند الفاظ دار المصنفین کے اراکین اور رفیقوں سے کہنا چاہتا ہوں۔ جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے آپ کی تصنیف و تالیف کا ایک خاص میدان ہندوستان کے قرونِ وسطیٰ کی تاریخ اور اس کی ایک امتیازی خصوصیت قلب و نظر کی وسعت ہے یعنی مختلف تہذیبوں اور معاشروں کی مثبت اور معروف اقدار کا اعتراف کرنا، ان کے اختلاف میں اشتراک اور اتحاد کے نقطے تلاش کر کے انھیں نمایاں کرنا۔ آپ کی یہ خصوصیت ہمارے دورِ محکومی میں جب تاریخ سیاسی مصلحتوں کے ماتحت مسخ کی جا رہی تھی بہت کام آئی۔ لیکن آپ یہ نہ سمجھیے کہ اس دورِ آزادی میں تاریخ کو تفریقی سیاست کا آلہ کار بنانا ختم ہو چکا ہے۔ آج یہی رجحان باقی ہے اور خاصا قوی ہے آج بھی دکھلانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ ہندو مسلم تہذیبوں میں کبھی میل نہیں ہوا، ہمیشہ ٹکر ہوتی رہی اور آیندہ بھی ہوتی رہے گی جب تک ایک تہذیب دوسری تہذیب میں جذب نہ ہو جائے۔ اس لیے آپ کو اس حقیقت سے چشم پوشی نہیں کرنی چاہیے کہ آپ کی سعی ابھی ناتمام اور آپ کا کام ابھی ادھورا ہے۔ آپ کو اور زیادہ محنت، ہمت اور استقلال کے ساتھ یہ جد و جہد کرنی ہے۔ تاریخ نگاری کو اس کجروی سے محفوظ رکھنے کی اور یہ واضح کرنے کی کہ گو قرونِ وسطیٰ میں ہندو مسلم تہذیبیں کے اپنے اپنے دائرے تھے لیکن ان میں ایک مشترک قطعہ بھی تھا جو اس عہد میں قومی تہذیب کی حیثیت رکھتا تھا۔ میرا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اس کا ثبوت فراہم کرنے کے لیے آپ زبردستی تاویل سے کام لیں، یہ نہ تو دیانتدار مورخوں کی حیثیت سے آپ کے لیے جائز ہے اور نہ آپ کو اس کی ضرورت ہے۔ آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں کہ اس کے ثبوت تاریخ کے صفحوں پر بکھرے ہوئے ہیں، صرف انھیں جمع کرنے اور ترتیب دینے کی ضرورت ہے۔ میرا یہ پختہ خیال ہے جسے تاریخی نظریہ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا، لیکن ذہنی عقیدہ کہہ سکتا ہوں کہ صرف ہندوستان میں ہندو مسلم تہذیبوں ہی میں نہیں بلکہ دنیا میں کہیں بھی دو تہذیبوں میں

ٹکراؤ نہیں ہوا، تہذیبیں ٹکرایا نہیں کرتیں بلکہ وحشتیں ٹکرایا کرتی ہیں، انسان کا وجود اس دنیا میں اربوں سال سے ہے، اس میں سے تہذیب کے چند ہزار سال نکال دیجیے تو باقی سارا زمانہ وحشت کا زمانہ تھا اس لیے آج ان افراد اور قوموں میں جنھیں ہم تہذیب کہتے ہیں، تہذیب کی ایک ہلکی سی پرت کے نیچے نہ جانے کتنی پرتیں وحشت کی دبی ہوئی ہیں جو موقع ملنے پر ابھر آتی ہیں، دو قوموں کی تہذیبیں جب تک اپنی اپنی وحشتوں کو دبائے ہوئے ہیں آپس میں لڑتی نہیں بلکہ گلے ملتی ہیں اور تہذیبی قدروں کا لین دین کرتی ہیں، مگر جب ان کی وحشتیں ان کی تہذیبوں پر غالب آجاتی ہیں تو ایک تہذیب دوسری تہذیب سے بھڑ جاتی ہے اور دونوں ایک دوسرے کو نوچنے، کاٹنے اور بھنبھوڑنے لگتی ہیں۔

آپ سے میری یہ التجا ہے کہ وحشتوں کی روداد دوسروں کے لیے چھوڑ دیجیے۔ آپ تہذیبوں کی کہانی لکھیے اور نئے ہندوستان کے ماضی کی روشنی میں حال کا یہ اہم ترین مسئلہ حل کرنے میں مدد دیجیے کہ کس طرح مختلف تہذیبوں کے الگ الگ رنگ و آہنگ کو ضروری حد تک قائم رکھتے ہوئے ان میں ہم رنگی و ہم آہنگی پیدا کرے جو ایک متحد اور مضبوط قوم بنانے کے لیے درکار ہے اور اپنے محبوب وطن کو ایسی مہذب انسانی برادری کا گھر بنانے میں ہاتھ بٹائیے، جس کے صدر دروازہ پر حالی کی یہ رباعی رقم ہو:

ہندو سے لڑیں نہ گبر سے بیر کریں　　شر سے بچیں اور شر کے عوض خیر کریں
دنیا کو جو کہتے ہیں جہنم ہے یہ　　وہ آئیں اور اس بہشت کی سیر کریں

ذاکر صاحب کا ایک خط

راج بھون، پٹنہ
۲۴-۲-۶۳ء

مکرمی جناب فاطمی صاحب، السلام علیکم
دونوں نوازش نامے ملے، یاد فرمائی کا شکریہ اور تاخیر جواب کی معذرت قبول فرمائیے۔ میں نے ونوبا جی کا انتخاب قرآن مجید غور سے دیکھا بہت اچھا ہے۔ اس سے مسلم اور غیر مسلم، سب قرآن کی تعلیم کو آسانی سے سمجھ سکیں گے۔ خدا ان کی سعی قبول فرمائے۔

مقدمہ یا پیش لفظ لکھنے کی بہت کوشش کی مگر کچھ نہ بن سکا۔ رہ رہ کر یہ خیال کہ تعلیمات قرآنی کی تعمیل میں کیا کیا کوتاہیاں مجھ سے سرزد ہوتی ہیں اور اپنی زندگی اس نقشے سے کتنی دور ہے جو قرآن چاہتا ہے، کچھ لکھنے کی ہمت نہیں کرنے دیتا۔ کسی دوسرے کو اپنی اس کیفیت کو سمجھانا دشوار ہے مگر یقین فرمائیے کہ سچ ہے اور باوجود کوشش کے اس نے کچھ نہ لکھنے دیا۔ امید ہے کہ آپ میری اس مجبوری کو سمجھ سکیں گے اور مجھے معاف فرمادیں گے۔

اگر بات ونوبا جی تک پہنچ چکی ہے تو ان سے بھی معاف کرا دیں گے۔ میرے دل میں ان کا جو احترام ہے اسے آسانی لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا۔ مسودے رجسٹرڈ ڈاک سے بیمہ کر کے واپس کرتا ہوں۔

مخلص
ذاکر حسین

آل احمد سرور

مردِ ذاکر

زمانہ جس کی تلاش میں تھا، یہی ہے ہمدم وہ مردِ دانا
نگاہ جس کی ہے عارفانہ، مزاج جس کا قلندرانہ

وہ جس کا دستور حق پسندی، وہ جس کا آئین دردمندی
وہ جس کے ایثار بیکراں کا ہے معترف آج تک زمانہ

جلال بھی ہے جمال بھی ہے یہ شخصیت کا کمال کہیے
خیال ہیں بجلیاں بہ افشاں لبوں پہ اک دلربا ترانہ

وہ جس کی چشمِ ستارہ بیں نے فلک بھی دیکھا جہاں بھی دیکھے
پسند لے دے کے جس کو آیا مگر کچھ اپنا ہی آشیانہ

چمن بھی آتش فشاں بھی دیکھے نئے نئے آشیاں بھی دیکھے
کہیں سنی داستانِ انجم کہیں سنا جنگ کا ترانہ

غلام قوموں میں کیا بصیرت نظر میں گرمی نہ دل میں وسعت
کسی کو پہچانتی نہیں ہیں وہ مردِ حُر ہو کہ مردِ دانا

سکوتِ ساحل سے کون دیکھے کنارِ ساحل سے کون پوچھے
کسی کا موجوں سے جنگ کرنا کسی کا طوفاں کو آزمانا

یہ بزم ابھی آشنا نہیں ہے جگر ابھی خوں ہوا نہیں ہے
ابھی مغنّی نے ہلکے ہلکے سروں میں چھیڑا ہے اک ترانہ

افق پہ ہے روشنی سی لیکن وہ چشمِ بینا کہاں سے لائیں
ابھی جبینوں سے جن کی چھوٹا نہیں فرنگی کا آستانہ

ورق ورق ہے مرا صحیفہ ملے تو کیونکر بنے تو کیونکر
اُدھر نئی آرزو کی گرمی، اِدھر خمارِ مئے شبانہ

"ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مردِ درویش جس کو حق نے دیے ہیں اندازِ خسروانہ"

آل احمد سرور

ذاکر صاحب کی واپسی پر

صد شکر اپنا مردِ قلندر پھر آگیا
صحرا سے تازہ دولت عرفاں لیے ہوئے
آنکھوں میں عزمِ کوہ کنی کی جلالتیں
باتوں میں لطفِ صبح بہاراں لیے ہوئے
افسردگی کے دور میں امید کی کرن
تاریکیوں میں شمعِ فروزاں لیے ہوئے

جذبہ، جسے کچل نہ سکا کوئی بھی ستم
شعلہ جو آندھیوں سے بھی برہم نہ ہو سکا
دیوانگی کے رقص، لہو کی ترنگ میں
انسانیت پہ جس کا یقیں کم نہ ہو سکا
ہر برقِ تازہ شمعِ سیہ خانہ بن گئی
دل وقفِ خود فریبیٔ ماتم نہ ہو سکا
سوزِ نفس کی آنچ بجھائے نہ بجھ سکی
خونِ جگر کا نقش تھا مدّھم نہ ہو سکا

محفل پہ آج موت کا سایہ ضرور ہے
تیری جبیں سے نور فشاں زندگی تو ہے
ذہنوں پہ چھا گیا ہے اندھیرا تو کیا ہوا
ہمدم تری نظر میں ابھی روشنی تو ہے

مرشد کی واپسی پہ یہ حاضر ہیں چند شعر
بے رنگ و بو ہیں پھول، مگر تازگی تو ہے

(ذاکر نمبر یونیورسٹی گزٹ)

آل احمد سرور

نئے علی گڑھ سے خطاب

(ذاکر صاحب کے توسط سے)

اے کہ کرنوں سے تری اپنے سیہ خانے میں
چاند کا نور، ستاروں کی چمک باقی ہے
لالہ کاری سے تری بادِ خزاں کے باوصف
اپنے ویرانے میں پھولوں کی مہک باقی ہے
یہ تری تلخ نوائی ہے کہ گمراہوں میں
اپنی منزل پہ پہنچنے کی للک باقی ہے
کون سمجھے ترے پُر سوز تخیل کے سوا
اب بھی ہر خاب میں شعلوں کی لپک باقی ہے

یہ لہو جس میں تب و تاب نفس سے تیرے
دیکھ ایوانِ حکومت میں چراغاں نہ بنے
لوگ ہر شمع کو فانوس پنہا دیتے ہیں
شعلہ اپنا بھی چراغ تہِ داماں نہ بنے
رگ ہر سنگ میں جو لعل و گہر بنتا تھا
وہ شرارہ بھی کہیں شمعِ شبستاں نہ بنے
موج جو کرتی تھی ہر گام پہ طوفاں تخلیق
کسی گلزار کی اک جوئے خراماں نہ بنے

ہند کے جلوۂ صد رنگ کا ہے پاس ضرور
اس میں سوزِ عرب و حُسنِ عجم یاد رہے
کارواں منزلِ نو کے لیے ہو گرمِ سفر
اپنی تہذیب کا بھی نقشِ قدم یاد رہے
چمن علم و ادب میں نئی کلیوں کے حضور
میر و غالب کے شگوفوں کا بھرم یاد رہے
محو ہوں عظمت شاہی کے حسیں افسانے
گر رہے یاد تو جمہور کا غم یاد رہے

درِ مے خانہ ہر اک رند پہ اب باز رہے
پینے والوں کا مگر پھر بھی اک انداز رہے

سنہ ۱۹۱۵ء

خلیل الرحمٰن اعظمی

اب نہ آئے گا کوئی آبلہ پا

مرثیہ کس کا کہیں
کس کا ماتم کریں
کس شخص کا نوحہ لکھّیں

زندگی کیا ہے
وہی ایک کہانی
وہی مانوس حقیقت
کہ جو ہر لمحہ بظاہر تو نیا ایک جنم لیتی ہے
مگر انجام وہی سب کا، وہی سب کا مآل
سب کی قسمت میں نہیں
زیست کا انعام،
تمناؤں کی تکمیل
مسرت کا حصول
سب پہ ہوتا نہیں کرنوں کا نزول
سب کے آگے مگر آتا ہے وہی ایک سوال
موت، یعنی جسدِ آدمِ خاکی کا زوال

مرثیہ کس کا کہیں
کس کا ماتم کریں
کس شخص کا نوحہ لکھیں
موت اور زیست کا یہ کھیل تو جاری ہے نہ جانے کب سے
کوئی آتا ہے یہاں اور کوئی جاتا ہے
خیر مقدم ہے کہیں اور کہیں آہنگ وداع
ایک محفل جو اجڑتی ہے تو سجھ جاتی ہے اک اور بساط
زہر غم ہے جو کہیں تو کہیں صہبائے نشاط

مرثیہ اُس کا کہیں
اُس کا ماتم کریں
اُس شخص کا نوحہ لکھیں
جس کے مرنے سے نہیں مرتا فقط ایک ہی شخص
جس کے مرجانے سے ایک عہد کو موت آتی ہے

مرگِ ذاکر پہ نہ کیوں اپنا ہی نوحہ لکھیں
کس کو اپنا کہیں، اک شخص تھا اپنا نہ رہا
کس کو بتلائیں کہ اس کا عہد کا انساں ہے ملول
روح کا زخم کوئی دیکھنے والا نہ رہا

سوزِ فن، خونِ جگر، نورِ یقیں، ذوقِ ہنر
کیوں یہ احساس ہے اب کچھ نہ رہا اس کے بعد
دور تک دشتِ جنوں میں نظر آتا نہیں کچھ
اب نہ آئے گا کوئی آبلہ پا اُس کے بعد

وحید اختر

وہ ایک شعلہ منوّر تھے جس سے لاکھوں دماغ

(ذاکر صاحب کی وفات پر)

وہ ایک شخص تھا — پھر ایک سے ہزار ہوا
وہ ایک گل تھا ، مگر فخرِ صد بہار ہوا
وہ ایک نور تھا ، جس سے تھے بے شمار چراغ
وہ ایک شعلہ ، منور تھے جس سے لاکھوں دماغ
وہ ایک لمحہ ، ازل آشکار ، ابد آثار
وہ ایک عزم جو تاریخ ساز ، عہد شکار

وہ ایک شخص تھا — پھر ایک سے ہزار ہوا
ہزاروں، لاکھوں، کروڑوں دلوں کا ناز بنا
جس انجمن میں گیا ، اس کا امتیاز بنا

وہ ایک گل تھا — مگر فخرِ صد بہار ہوا
تبسم اس کا گلابوں کا مسکراتا چمن
وجود اس کا محبت کی آگ سے روشن

وہ ایک نور تھا ـــــ جس سے تھے بے شمار چراغ
وہ جامعات و مدارس کی شمع عالم تاب
وہ ہنستے کھیلتے بچوں کی خوش دلی کی کتاب
وہ ایک شعلہ ـــــ منور تھے جس سے لاکھوں دماغ
تعصبات سے نفرت کی آندھیاں اٹھیں
جہالتوں سے اندھیروں نے سازشیں کرلیں
مگر اندھیرے میں وہ نور ارجمند رہا
جہاں جہاں بھی جلے علم کے سنہرے چراغ
ہر اک چراغ کے شعلے میں سر بلند رہا
وہ ایک نور تھا جو ہر چراغ میں چمکا
وہ ایک شعلہ تھا، جو ہر دماغ میں چمکا
وہ ایک عزم ـــــ جو تاریخ ساز، عہد شکار
جو سرفروش و سرافرازِ زندگی کا نام
جو ظلم و جبر کا باغی، جو صدرِ بزمِ عوام
وہ ایک لمحہ ـــــ ازل آشکار، ابد آثار
زماں کے سیل میں ہر لمحہ لمحۂ گزراں
زماں کے سیل میں ہستی ہے نیستی کا خروش
زماں کے سیل میں ہے زندگی عدم بردوش
مگر وہ لمحہ، جسے سرِّ کُن فکاں کہیے
زمانہ آفریں، تخلیقِ بے کراں کہیے
اُس ایک لمحے میں صدیاں اسیر ہوتی ہیں

وہ ایک لمحہ ہے سرچشمۂ حیات و زماں
وہ اندھے سیلِ زماں کا ہے دیدۂ نگراں
اُسی کا نام ازل ہے اسی کا نام ابد
ہم ایسے لمحے کو کہتے ہیں عہد سازِ انساں

وہ ایک لمحہ تھا ایسا ہی، جو ابھی ڈوبا
وہ ایک شخص تھا ایسا ہی، جو ابھی بچھڑا

وہ لمحہ سیلِ زماں میں کبھی گم نہیں ہوگا
وہ شخص بچھڑا کہاں ہے، یہیں کہیں ہوگا
گلاب ہنستے ہیں، اطفال مسکراتے ہیں
یہ تازگی، یہ تبسم اسی کی دولت ہے
ہیں جامعات و مدارس کی گودیاں آباد
یہ تشنگی، یہ تمنا اسی کی فطرت ہے
کھلے ہیں آج بھی میخانہ ہائے فکر و خیال
یہ روشنی کی پرستش اسی کی جرأت ہے

وہ بجھ گیا ہے، مگر روشنی ہے کام اس کا
وہ مر گیا ہے، مگر زندگی ہے نام اس کا

شہریار

ذاکر صاحب

نسیمِ صبح رو رہی ہے وادیٔ گلاب میں
لہو کی ایک بوند بھی نہیں ہے آفتاب میں
سفید و سُرخ پھول آنسوؤں میں بھیگنے لگے
فضا میں تتلیوں کی ہچکیوں کے سنکھ بج اُٹھے
اداس نکہتوں کی ریشمی زبانوں پر خدا کا نام ہے

حیات بابِ مرگ سے گذر کے جاوداں ہوئی
حصارِ جسم سے نکل کے روح بے کراں ہوئی
سفر کا لازوال نشّہ آخرش اُتر گیا
سفیرِ شہرِ زندگی نے ڈھونڈ لی ہے اک جگہ قیام کی
طویل ہو رہی ہیں سرحدیں سکوتِ شام کی
فرشتے آسمان سے درود پڑھنے آئے ہیں
خدا کی رحمتوں کا اعتراف ہم پہ فرض ہے
طوافِ قبرِ ذاکرِ حسین ہم پہ قرض ہے

سید نظر برنی

ذکرِ ذاکر حسین

ہو نہیں سکتی کبھی کم عظمتِ ذاکر حسین
رہتی دنیا تک رہے گی عزتِ ذاکر حسین

اک نگاہِ مشفقت تھی باعثِ صد افتخار
دور تک پھیلی ہوئی تھی نکہتِ ذاکر حسین

غازیِ کردار تھا وہ اور مردِ باعمل
مشعلِ راہِ عمل ہے تربتِ ذاکر حسین

پیکرِ صدق و صفا تھا روشنیِ علم و فن
ہے چمن کی ڈالی ڈالی مدحتِ ذاکر حسین

مشکلیں آسان کرتا ہی رہا وہ عمر بھر
باعثِ فخرِ وطن تھی ہمتِ ذاکر حسین

کچھ سبق ایسا دیا ہے نازشِ پندار نے
جس سے ظاہر ہو رہی ہے شوکتِ ذاکر حسین

آنے والی کل بتائے گی حصولِ مدعا
اور بھی بڑھ جائے گی کچھ وقعتِ ذاکر حسین

ہم سے پوچھے کوئی اس مردِ مجاہد کا چلن
عکسِ آئینہ سمجھیے سیرتِ ذاکر حسین

آ رہی ہیں دور تک پرچھائیاں اس کی نظر
لالۂ صد رنگ ہے اک سطوتِ ذاکر حسین

احد پریمی

آہ وہ ماہِ درخشاں سو گیا

ڈاکٹر ذاکر حسین کے سانحۂ ارتحال پر

مثلِ ماہِ نو، جبینِ ہند پر
ایک مدت سے تھا جو تابندہ تر
جس کی ضو افشانیٔ احساس سے
خطّۂ گنگ و جمن روشن رہا
جس کے انوارِ نظر سے آج تک
چہرۂ ارضِ وطن روشن رہا
جس کی آب و تابِ عقل و ہوش سے
"جامعہ"[1] مثلِ چمن روشن رہا
جس کی تنویرِ شعور و ذہن سے
اک جہانِ علم و فن روشن رہا
آہ وہ ماہِ درخشاں سو گیا
کیا کہیں کتنا اندھیرا ہو گیا

[1] جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

کوئی اس راز کو اب تک نہ سمجھا ہے نہ سمجھے گا — غبارِ دل نشیں بیگانۂ جام و سبو رہنا
حقیقت کی حقیقت ہے فسانے کا فسانہ ہے — تلاشِ متصل اور بے نیازِ آرزو رہنا
نہ اپنے زہد پہ نازاں نہ پروائے زمانہ بھی — ہمیشہ اس کا محوِ آیۂ لاتقنطو رہنا
مۓ صافی سے لے دے کے کچھ اک ایسا تعلق تھا — دمِ گلگشتِ صحرا بھی ہمیشہ باوضو رہنا

وہ دانا جو کہ چمکا تھا چراغِ رہگذر ہوکر — سنواری زلفِ گیتی جس نے خود سے بے خبر ہوکر
زمانہ میں وفا کو جس کی شفقت نے سنوارا تھا — کرم کرتا تھا چھوٹوں پر بھی جو صاحب نظر ہوکر
ہے ناممکن کہ وہ شمعِ ادب خاموش ہوجائے — ہے ناممکن وہ افسانہ بنے رقصِ شرر ہوکر
جلایا ہے چراغ اپنا اسی قندیلِ رخشاں سے — رہے ہیں اس حریمِ ناز پہ ہم سنگِ در ہوکر
اسی وادی میں جس سے اپنا میرِ کارواں گذرا — تمنا ہے کہ مٹ جائیں غبارِ رہ گذر ہوکر

حکیم سید نورالعین حسن راغب چھتاروی

قطعاتِ تاریخ وفات

هُوَ اللّٰهُ الغَفَّار

۸۹ ھ ۱۳

وَھُوَ البَاقِی الَّذِی لَا یَمُوتُ

۸۹ ھ ۱۳

سالِ وصالِ ناگاہ ڈاکٹر ذاکر حسین

۶۹ ع ۱۹

آہ ذاکر حسین خاں صاحب — ناگہاں کرد ارتحالِ الیم

راغب از سالِ فوت بگو — صدرِ جمہوریہ بخلد مقیم

۸۹ ھ ۱۳

گنج علوم، مہرِ سیاست، وقارِ ہند — ناگاہ سوئے ملکِ عدم کرد انتقال

راغب پئے فراق بایمائے غیب گفت — ذاکر حسین واصلِ باری، سنِ وصال

۸۹ ھ ۱۳

در سنہ ۱۹۶۹ء

فخرِ ملک و قوم ملت ڈاکٹر ذاکر حسین — تھے جو مردِ باصفا، خوش خلق و پاکیزہ خصال

آہ وہ درویش سیرت، ہائے وہ حق آشنا — وہ مفکر وہ مدبر بے نظیر و بے مثال

حیف وہ دنیائے فانی سے اچانک چل دیئے — ہو گیا سارا جہاں تاریکِ افسوس و ملال

جب ہوئی راغب کو تاریخ جدائی کی طلب — کہہ دیا فکرِ رسا نے لکھ یہ سالِ انتقال

بے سروپا ہو گئے دستِ اجل سے آج دیکھ — نظم و تدبیر و سیاست عظمت و جاہ و کمال

۹۰۰ ۱۶ ۶۱ ۹۴۰ ۱ ۴۱

۶۹ ھ ۱۹

حرمت الاکرام

غالب کی صدی روتی ہے

کون محفل سے اٹھا، خوش لقبی روتی ہے
آگہی روتی ہے آشفتہ سری روتی ہے

وقت وہ آن پڑا ہے کہ ہے غم خود بیتاب
اک کسک وہ کہ ہے پہلو میں دبی روتی ہے

سسکیاں بھرتی ہے ہر موج، سرِ آبِ رواں
جاؤ گلشن میں تو پھولوں کی ہنسی روتی ہے

رات چھائی تو ستاروں نے لہو برسایا
صبح آئی تو نسیمِ سحری روتی ہے

دور تک سلسلۂ غم کی ہے بیدادگری
دلبری روتی ہے بالغ نظری روتی ہے

پیاس سیراب جسے کر گئی اس کی خاطر
تشنگی روتی ہے پیمانہ کشی روتی ہے

اپنی تقدیر کا معمار بنے کون اس طرح!
خودگری سوگ میں ہے خودنگری روتی ہے

ساعتیں بڑھتی ہیں تھم تھم کے کہ عالم ہے دگر
زندگی، وقت کے سینے سے لگی روتی ہے

منزلِ فرض سے گزری مگر اتنی ہے نڈھال
موت بھی اپنی ہی بانہوں میں چھپی روتی ہے

نطق، الفاظ کے نرغے میں کھڑا ہے بے بس
خامشی، گوشۂ عزلت میں پڑی روتی ہے

روشنی کہتی ہے، کیا ہو گیا سورج میرا؟
تیرگی، دور کہیں دور کھڑی روتی ہے

کل سنواری تھی یہ غالب کی صدی ذاکر نے
آج ذاکر کو یہ غالب کی صدی روتی ہے

صبا جائسی (علیگ)

ذاکر صاحب کی یادیں

وہی شام و سحر بھی ہے وہی رنگِ چمن بھی ہے — وہی شورِ عنادل ہے وہی بوئے سمن بھی ہے
نسیم آئی، گھٹا چھائی، ہنسیں کلیاں، جھکا سبزہ — وہی ہے آشیاں اپنا، وہی صحنِ چمن بھی ہے
وہی دستِ حنائی آج بھی ساغر لنڈھاتا ہے — وہی صہبا بھی ساقی بھی چراغِ انجمن بھی ہے
وہی سوزِ دروں ہے آج بھی گرمِ سفر تنہا — وہی اہلِ جنوں بھی ہیں وہی دیوانہ پن بھی ہے
وہی عشاق کے نالے وہی رو رو کے جینا ہے — جھکائے اپنی نظروں کو وہی گل پیرہن بھی ہے

یہ مانا اور بھی ہوں گے چمن میں دیدہ ور پیدا — زمانہ خود کرے گا صاحبِ فکر و نظر پیدا
یہ مانا محفلِ ہستی سے اُٹھے گا کوئی ایسا — جو اپنی نارسائی سے کرے گا بال و پر پیدا
یہ مانا فطرتِ انساں نہیں خاموش رہ سکتی — جبینِ شوق خود کرتی رہے گی سنگِ در پیدا
یہ مانا فیضِ قدرت کی رہے گی کار فرمائی — دیارِ علم و فن میں ہوں گے کچھ آشفتہ سر پیدا
یہ مانا دہر میں تاریکیاں دائم نہیں رہتیں — کہ ہوتی ہے ہمیشہ ظلمتِ شب سے سحر پیدا

وہ دانا جس کا شیوہ تھا قتیلِ جستجو رہنا — گریباں چاک ہونا اور بے فکرِ رفو رہنا